نگار

مجلۂ علمیہ و ادبیہ

رئیس التحریر

نیاز فتحپوری

ماہ آیندہ میں زیب النسا کی تصویر

شایع ہوگی جو نہایت کاوش و جستجو کے بعد حاصل ہوئی ہے اور نہایت اہتمام سے رنگین طیار کرائی گئی ہے
اِس تصویر کے متعلق ایک بسیط مضمون بھی ہوگا۔ تصویر چونکہ ایک جنس نایاب ہے اس لئے صرف خریداران
نگار تک محدود رکھنا بخل سمجھکر ہم نے ارادہ کیا ہے کہ "نگار" سے علیحدہ بھی یہ تصویر نفیس دوہرے کٹ ماؤنٹ
(cut mount) پر اہل ذوق کے لئے طیار کرائی جائے۔

تصویر کی قیمت تو صرف ۸ آنہ ہے، مگر پیکنگ کی احتیاط اور محصول ڈاک میں چار آنے سے کم صرف نہ ہوگا اس لئے
فرمائش کے ساتھ بارہ ۱۲ آنے کے ٹکٹ وصول ہونے کی ضرورت ہے۔

منیجر

اُجرت نامہ اشتہار رسالہ نگار

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
۱۲	۶۰ عہ	۳۵ عہ	۲۰ عہ
۶	۳۵ عہ	۲۰ عہ	۱۲ عہ
۳	۲۰ عہ	۱۵ عہ	ملعہ ر
۱	للعہ	۵ ر	۳ عہ
اُجرت اشتہار پیشگی لیجائیگی	معاہدہ اشتہار منسوخ نہیں ہو سکتا	مدت معینہ کے اندر مضمون اشتہار بدل سکتا ہے	کسی اشتہار کا جزو منظور نہیں کیا جائیگا

ٹائٹل کے اشتہارات کی اُجرت نرخ نامہ سے ۲۵ فیصدی زائد ہوگی

نگار

(۱) ہر انگریزی مہینہ کے تیسرے ہفتہ میں شائع ہوجایگا، اسلئے اگر ۳۰ تک نہ پہونچے، تو ہمیں مطلع فرمایئے
(۲) چونکہ ایک مشترکہ سرمایہ سے جاری ہوتا ہے، اسلئے مالی مشکلات کی وجہ سے اس کے بند ہونیکا خیال دل میں نہ لایئے۔
(۳) پانچ روپیہ میں ایک سال تک، تین روپیہ میں چھ ماہ تک آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہیگا۔ اس سے کم مدت کیلئے درخواست خریداری آپ کی شان کے منافی ہے، اس لئے ہم بھی اِس کی تعمیل سے احتراز کریں گے۔
(۴) پیشگی قیمت روانہ کرنیکا مشورہ آپ کو دیتا ہے، کیونکہ وی۔ پی میں آپکا نقصان ہے، جو ہمیں کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا، البتہ اگر آپ چاہیں تو ہر ماہ ۸ آنے کے ٹکٹ بھیجکر رسالہ حاصل کر سکتے ہیں۔
(۵) جواب طلب امور کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔ ترسیل زر درخواست خریداری و اشتہار وغیرہ کے متعلق منیجر نگار آگرہ کو مخاطب کیجئے
(۶) ترسیل مضامین وغیرہ کے متعلق ایڈیٹر صاحب سے بھوپال کے پتہ سے مراسلت کیجئے۔

منیجر نگار - آگرہ

نگار

رئیس التحریر : نیاز فتحپوری
معاون مدیر : مخمور اکبر آبادی

(رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴)

مجلد ۱ — رمضان ۱۳۴۰ھ مئی سنہ ۱۹۲۲ء — قیمت سالانہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
شمار ۴ — قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

فہرست

ملاحظات	نیاز	۲	نقص تربیت	آغا حیدر حسن دہلوی	۴۶
علم الہیئت جدیدہ	نیاز	۳	امیر عبدالقادر جزائری	نیاز	۴۹
لالہ رخ	لطیف الدین احمد	۱۲	فرمودۂ غالب	غالب منصور	۶۰
غزل فارسی	نیاز	۲۵	اندلس کی شہزادی	حافظ امام الدین	[illegible]
جنگل کی شاہزادی (نظم)	جوش ملیح آبادی	۲۶	مجرم	نیاز	۶۷
ٹیگور	مولوی حامد حسن قادری	۲۹	نقوش مانی	حضرت مانی جائسی	۷۴
ایک مایوس کی آخری تمنا (نظم)	مخمور اکبر آبادی	۴۴	معلومات	نیاز	۷۵

انتقاد ۸۰

ملاحظات

(۱) لیتھو پریس کی دنیا میں، جہاں خوئے حیلہ جوئی کی نزاکت جس حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے، رمضان کا قیام اور انتظار عید ایسے اسباب تھے کہ اس پرچہ کو شائع ہی نہ ہونا چاہئے تھا، اس لئے اگر یہ نمبر صرف ایک ہفتہ کی تعویق سے شائع ہوتا ہے، تو اسے آپ اعجاز ہی یقین کیجئے۔

(۲) میں نے محسوس کیا ہے کہ بعض حضرات صرف اسلئے نگار کی تعریف کرتے ہیں کہ اُنکی "ستائشگرانہ" تحریریں شائع کر دیجائینگی۔ افسوس ہے کہ اُنکی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ براہ کرم اس نوع کی مراسلت میں صرف خلوص کو پیش نظر رکھا جائے، بیجا تعریف اخلاق کی کمزوری ہے اور اہل عقل کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ۔

(۳) بعض حضرات نے شکایت کی ہے کہ نگار کی زبان مشکل ہوتی ہے، لیکن میں بہت خوش ہوتا، اگر وہ مثال میں کچھ الفاظ اور فقرے بھی نقل کر دیتے، تاکہ میں غور کر سکتا۔ ورنہ یوں تو عمومی تبصرہ کبھی مجھے راہ راست پر نہیں لا سکتا۔ بعض نفوس لوح نگار کی سادگی پر بھی چیں بہ جبیں ہیں۔ ہم افکار کی اس "سادہ لوحی" کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

(۴) وہ قوم جو شام کے وعدہ کو "نیت شب بخیر" کہکر اُسے مضمحل کر دینے کی عادی ہو اور جو مستقبل کے خطرات کو بھی یوں کہکر ٹال دیتی ہو کہ "مترس از بلائے کہ شب درمیان ست" اس قوم کے افراد کا کوئی وعدہ کرنا اور مستقبل پر غور کرنا ہی کیا، اس لئے اگر ہم نے اس وقت تک نگار کے متعلق کوئی فہرست مواعید دیگر رسائل کی طرح پیش نہیں کی، تو صرف اس ڈر سے کہ مبادا ہم انہیں پورا نہ کر سکیں، ورنہ یوں تو تجاویز کا ایک طوفان ہم اپنے دل میں لئے ...ے ہیں اور ممکن ہے کہ ایک سال کے اندر ہی اس کے آثار بروئے کار آجائیں۔

(۵) گذشتہ نمبر میں بہت سی غلطیاں کتابت کی باقی رہ گئیں، جس کا ہمیں سخت افسوس ہے۔ چونکہ طباعت ...میں صحت کا دعوے کرنا، ایسا ہی ہے، جیسے نبوت کا دعوے کرنا، اس لئے ہم سے یہ گستاخی تو کبھی ...ں ہو سکتی، البتہ ان غلطیوں کا اعتراف ضرور اپنے اختیار میں ہے اور اس باب میں آپ کبھی ہمیں بخیل ...ئیں گے۔

اڈیٹر

نگار

مجلد ۱ شمار ۴	مئی سنہ ۱۹۲۲ء رمضان سنہ ۱۳۴۰ھ	قیمت سالانہ پانچ روپیہ قیمت ایک پرچہ ۸/

علم الہیئت الجدیدہ

(۱)

قانونِ تجاذب

کپلر کے اصولِ ثلاثہ

اور

نیوٹن کا نظریۂ کششِ اجرام

یہ ہر شخص کا تجربہ ہے کہ جب وہ کسی پتھر کے ٹکڑے کو اوپر سے چھوڑتا ہے تو وہ سیدھا زمین پر گر جاتا ہے اور اس واقعہ سے اُسے کوئی حیرت بھی نہیں ہوتی، لیکن اگر ہمارے سامنے مقناطیس کے ذریعہ سے کوئی لوہے کا ٹکڑا کھینچ لیا جائے، یعنی اگر کوئی آہنی چیز کسی پارۂ مقناطیس سے آکر متصل ہو جائے تو ہم اس کو نگاہِ تعجب سے دیکھیں گے، درانحالیکہ وہ قانونِ فطرت جو ایک وزنی چیز کو زمین کی طرف منجذب کر دیتا ہے اسی قدر دلچسپ ہے جس قدر کششِ مقناطیس۔ جس طرح مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے اُسی طرح زمین بھی تمام اشیاء کو اپنی طرف جذب کرتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ مقناطیس کا عمل بہت محدود اشیاء پر ہوتا ہے اور زمین کی کشش بہت عام وسیع اور عالمگیر ہے۔

تم اپنے ہاتھ میں پیسے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لو اور زمین کی طرف اُسے چھوڑ دو تو سب سے پہلے تم یہ محسوس کروگے کہ پیسے کے ٹکڑے کو زمین تک پہونچنے میں کچھ وقت صرف ہوا۔

اب تم دوسرے ہاتھ میں اُس ٹکڑے سے زیادہ وزنی ٹکڑا لو اور دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ دو تو دونوں زمین پر ساتھ ہی ساتھ گریں گے۔ حالانکہ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زیادہ وزنی چیز زیادہ سرعت کے ساتھ زمین کی طرف آئیگی اور ہلکی چیز کم سرعت کے ساتھ، لیکن یہ غلط ہے اور تم ہر وقت تجربہ کر سکتے ہو کہ جب دو مختلف وزن کی چیزوں کو ایک ساتھ چھوڑا جائیگا تو وہ ساتھ ہی ساتھ زمین پر گریں گی۔ یہاں تک کہ اگر تم ایک ہاتھ میں بوتل کا کاگ لو جو بہت ہلکا ہوتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں سنگ مرمر کا ٹکڑا اور دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ دو تو یہ دونوں زمین تک ایک ہی ساتھ پہونچیں گے۔

البتہ اگر تم ایک ہاتھ میں پر لوگے اور دوسرے ہاتھ میں لوہے کا ٹکڑا تو پر کو زمین تک پہونچنے میں زیادہ دیر لگیگی، لیکن اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پر کو ہوا آسانی کے ساتھ روک سکتی ہے، اور وہ ہوا میں تیرتا ہوا زمین کی طرف آتا ہے برخلاف ایک وزنی چیز کے کہ ہوا اس کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوتی اور وہ دفعتہً زمین پر آجاتی ہے، لیکن اگر تم اس پر کو کسی پیسہ کے اوپر رکھو اور پھر پیسہ کو ترچھا کر کے چھوڑ دو تو پر بھی ساتھ ہی ساتھ آئیگا کیونکہ اس صورت میں پیسہ کے وزن یا ثقل نے پر کے لئے راستہ صاف کر دیا اور ہوا اس کی مزاحم نہیں ہوئی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ ایک چیز کا ہلکا یا بھاری ہونا غیر معتبر ہے اور ایک متعین بلندی سے جب مختلف اوزان کی چیزیں زمین کی طرف چھوڑی جائیں گی تو وہ ایک ہی ساتھ اور ایک ہی وقت میں زمین پر گر پڑیں گی۔

مختلف طریقوں سے اس کا تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اوپر سے زمین تک آنے میں ایک چیز فی سکنڈ ۱۶ فٹ کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک بوتل کا کاگ اور اس سے بھی زیادہ ہلکی چیز ۱۶ فٹ کی بلندی سے صرف ایک سکنڈ میں زمین تک پہونچ جائیگا۔ یہ اصول اس قدر عام اور مستحکم ہے کہ دنیا کے جس حصہ میں عمل کروگے نتیجہ ایک نکلے گا۔ البتہ مختلف مقامات میں تجربہ کرنے سے خفیف سا فرق ضرور محسوس ہوگا، لیکن اس کے اسباب کچھ اور ہیں جن کا بیان کرنا یہاں ضروری نہیں، اور جو کشش ثقل کے اس اصول پر موثر نہیں ہوتے۔

اب اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر یہ دیکھنا چاہئے کہ سطح زمین سے اوپر بلندی میں کس حد تک یہ حقیقت باقی رہتی ہے۔ اس غرض کے لئے اگر کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں ایک وزن کو نیچے تک آنے میں بنسبت سطح زمین کے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے۔ ہرچند یہ فرق بہت کم ہوگا تاہم اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اسی طرح اگر ہم اور بلندی پر چڑھ جائیں تو یہ قانون تجاذب پایا تو وہاں بھی جائیگا، لیکن بعد زمین کے ساتھ ساتھ اس میں کمی ضرور ہوتی جائیگی۔

ہم غبارہ میں بیٹھکر پانچ چھ میل سے زیادہ بلند نہیں جا سکتے۔ لیکن فرض کرو کہ ایک شخص ڈہائی لاکھ میل زمین سے بلند ہو جائے اور وہاں سے وہ کسی وزنی چیز کو نیچے کی طرف چھوڑے تو وہ اول نظر میں محسوس کریگا کہ وہ چیز معلق ہو کر ایک جگہ قایم ہو گئی ہے اور نیوٹن کا یہ نظریہ کہ قانون تجاذب اس قدر بلندی پر بھی اپنا کام کر رہا ہے غلط ثابت ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ مگر تھوڑی دیر میں معلوم ہو گا کہ وہ چیز نہایت آہستہ آہستہ نیچے کی طرف جا رہی ہے اور جس قدر نیچے ہوتی جاتی ہے اس کی سرعت رفتار بڑھتی جا رہی ہے۔

ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ ڈھائی لاکھ میل کی بلندی سے یہ تجربہ کرنا ناممکن ہے، اس لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ واقعی وہاں قانونِ تجاذب پایا جاتا ہے یا نہیں لیکن یہ اعتراض غلط ہے کیونکہ اتنی ہی دور اسکا تجربہ اب بھی ہو رہا ہے اور ایک چیز اتنی ہی دور سے زمین کی طرف کھنچی چلی آ رہی ہے اور وہ چیز چاند ہے۔ پھر چونکہ ہم اس کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ چاند زمین کی طرف فی سکنڈ کس رفتار سے جذب ہو رہا ہے، اس لئے ہم زمین کی قوتِ کشش کو بھی اچھی طرح معلوم کر سکتے ہیں۔ یہی تھی وہ حقیقت جس نے نیوٹن کو بتا دیا کہ اگر کوئی چیز دو لاکھ انتالیس ہزار میل کی بلندی سے بھی (جو بلندی چاند کی ہے) چھوڑی جائیگی تو زمین اُسے اپنی طرف کھینچ لیگی۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ زمین کی قوتِ کشش فاصلہ کے لحاظ سے کس قدر کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کے متعلق ماہرین ہیئت نے متعدد تجربے کئے اور آخر کار اس نتیجہ پر پہونچے کہ زمین سے اوپر ہم جس قدر بلند ہوتے جائیں گے اسی نسبت سے ریاضی کے ایک متعین اصول کے ماتحت وزن بھی کم ہوتا جائیگا جو عبارت ہے زمین کے جذب مرکزی سے۔ اس کو اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ اگر کوئی چیز چار پونڈ وزن کی مرکز زمین سے چار ہزار میل بلند پہنچ جائیگی تو اس کا وزن صرف ایک پونڈ رہ جائے گا

اس تجربہ کے ماتحت جب ریاضی سے مدد لی گئی تو حسب ذیل اصول قرار پائے:۔

وزن ÷ { (فاصلہ + نصف قطر زمین) ÷ ½ قطر زمین }²

یعنی جو فاصلہ مرکز زمین سے اس چیز تک ہے اس کو نصف قطر زمین سے تقسیم کرنے کے بعد جو خارج قسمت حاصل ہو اور پھر اس کے مربع سے وزن کو تقسیم کیا جائے تو جو نتیجہ حاصل ہو گا وہی وزن ایک چیز کا ہو گا۔ چنانچہ اس پر قیاس کر کے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ اگر یہی چار پونڈ وزن کی چیز آٹھ ہزار میل تک پہونچا دی جائے گی تو اسکا وزن صرف ۴/۹ پونڈ رہ جائے گا اور اگر چاند کی سطح تک پہونچ جائے گی جو تقریباً دو لاکھ چالیس ہزار میل مرکز زمین سے ہے

تو اس کا وزن صرف $\frac{1}{9..}$ پونڈ رہ جائیگا۔

یہ ایک نہایت عام فہم اور معمولی صورت جذب زمین کے سمجھنے کی ہے ورنہ حقیقتاً یہ مسئلہ بہت مشکل ہے علی الخصوص اس وقت جبکہ تجاذب کے اصول تمام اجرام فلکی سے وابستہ ہیں اور فضائے بسیط میں پھیلے ہوئے تمام کرے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔

یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ زمین چاند کو اور سورج زمین کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ چاند کیوں نہیں زمین پر ٹوٹ پڑتا اور زمین کیوں نہیں سورج سے ٹکرا جاتی۔ اسی طرح اگر اور تمام اجرام فلکی ایک دوسرے کو کھینچ رہے ہوں تو کیوں اُن میں باہم تصادم نہیں ہو جاتا لیکن بہ ادنیٰ تامل معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر تمام اجرام سماوی ساکن ہوتے تو باہم تصادم ہو جاتا۔ مگر چونکہ اُن میں سے ہر ایک اپنے محور پر نہایت سرعت کے ساتھ گردش کر رہا ہے یعنی خود اس کے اجزا اپنے مرکب کی طرف کھینچ رہے ہیں، اس لئے دوسرے اجرام کی کشش کی مدافعت ہوتی رہتی ہے۔
ذیل کی صورت سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے:۔

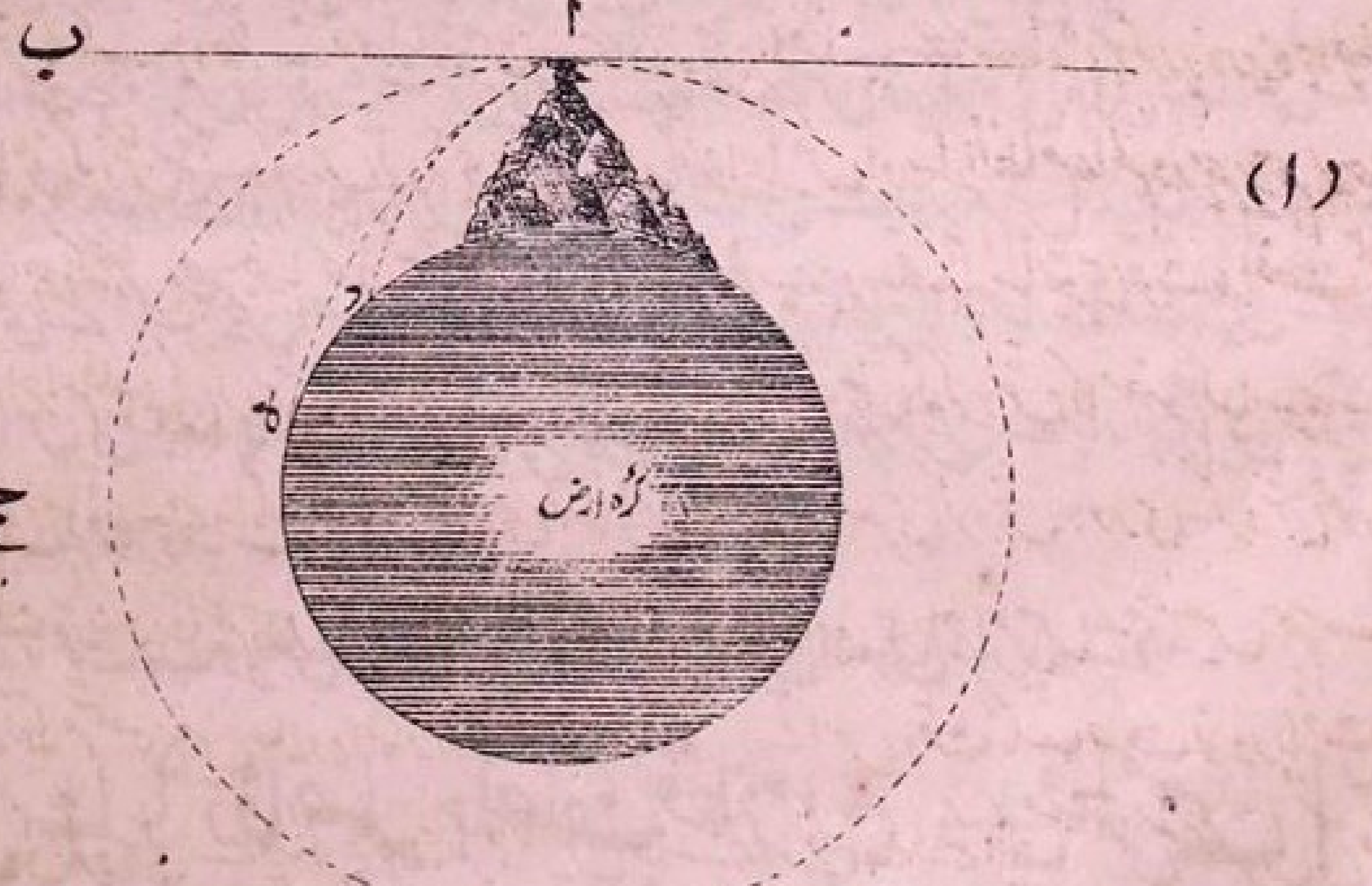

اگر ایک توپ معمولی قوت کے ساتھ مقام ا سے جو پہاڑ کی چوٹی ہے ب کی طرف سر کی جائے تو گولا فوراً ایک خمیدہ راستہ اختیار کرکے د کے اوپر گریگا۔ اگر زیادہ قوت سے کام لیا جائیگا تو وہ اور آگے بڑھکر مقام ھ پر گریگا لیکن اگر کوئی

نہایت قوی توپ بنائی جائے جو فی سکنڈ دس پندرہ میل کی رفتار سے گولے کو پھینک سکے تو وہ ا۔ج کا راستہ اختیار کرے گا۔ اور اس کی سطح رفتار زمین سے اسی قدر بلند رہے گی جتنی سر ہونے کے وقت قایم ہوئی تھی۔ جب گولا نقطہ ج پر پھونچے گا تو اس کی رفتار وہی قایم رہے گی اور وہ دائرہ زمین کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے ربع کو طے کرکے آخرکار اسی نقطہ پر پہنچ جائیگا، جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔ اگر پہاڑ کی چوٹی جہاں سے گولا روانہ ہوا تھا محو کردی جائے تو بھی وہ برابر معلق حالت میں گردش کرتا رہے گا۔

اب خیال کو اور زیادہ وسیع کرو اور سمجھو کہ اگر ایک توپ اتنی بڑی بنائی جائے جو دو ہزار میل قطر کے گولے کو تین ہزار فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے پھینک سکے، اور دس لاکھ میل سطح زمین سے بلند کسی مقام سے سر کیا جائے تو یہ گولا نکل کر صرف چار ہفتے میں ساری زمین کا چکر لگا سکیگا اور ہمیشہ اسی طرح گھومتا رہے گا۔

ایک شخص اس کو صرف وہم و گمان خیال کرے گا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ایک گولا اتنا ہی بڑا زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے، جسے چاند کہتے ہیں۔ پھر جس طرح چاند زمین کے گرد چکر لگا رہا ہے، اسی طرح زمین آفتاب کے گرد گھوم رہی ہے اور اجرام فلکی کا باہمی تجاذب تصادم سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر آج زمین ساکن ہوجائے یا چاند سے اس کی گردش سلب ہوجائے تو چاند زمین سے اور زمین آفتاب سے متصادم ہوکر ریزہ ریزہ ہوجائیں۔ اسی طرح اگر اور اجرام فلکی اپنی گردش ترک کردیں تو وہ بھی آپس میں ٹکرا جائیں اور سارا نظام عالم درہم برہم ہوجائے۔

اس سے ثابت ہوا کہ اصل چیز جو باعثِ کشش ہے اور جو منجذب ہونے کے ساتھ ہی قوت مدافعت بھی اپنے اندر رکھتی ہے وہ اجرام فلکی کی گردش ہے، اس لئے ہم بتانا چاہتے ہیں کہ گردش کا مفہوم کیا ہے۔

گردش دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک گردش محوری کہلاتی ہے اور دوسری گردش دوری۔ گردش محوری سے تو کوئی کرہ خالی نہیں ہے ورنہ وہ قایم نہیں رہ سکتا۔ البتہ گردش دوری ان ہی اجرام میں ہے جنہیں ہم سیارہ کہتے ہیں اور جو ہمارے نظام شمسی میں علاوہ اقمار اور دُم دار ستاروں کے اس وقت تک صرف نو دریافت ہوئی ہیں۔ ہم ان سیاروں کی گردش سے یہاں بحث کرنا نہیں چاہتے کہ اس کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے، البتہ اصولِ تجاذب کے سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ان سیاروں کی گردشِ دوری (orbits) کس صورت سے ہوتی ہے۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کے گرد سیاروں کی گردش بالکل دائرہ کی صورت میں ہوتی ہوگی اور اس سے قبل یہی یقین کیا جاتا تھا، لیکن سب سے پہلے کیپلر نے اس کی تردید کی اور دنیائے ہیئت میں اپنے انکشاف سے بڑا زبردست

انقلاب پیدا کر دیا۔

یہ صحیح ہے کہ سیاروں کی گردش دائرہ کی طرح ہوتی ہے، لیکن اُن سے مکمل دائرہ نہیں بنتا بلکہ بلبلہ کی شکل کا ایک دائرہ بنتا ہے جسے انگریزی میں ایلپٹکل (Elliptical) اور عربی میں اہلیلجی کہتے ہیں۔

کاغذ کے ایک تختہ پر الگ الگ کچھ فصل سے دو آلپین گاڑ دو اور موٹے تاگے کا ایک حلقہ اُن کے گرد ڈال دو اسکے بعد پنسل یا قلم کی نوک سے تاگے کو تان کر آلپینوں کے چاروں طرف ایک دائرہ کھینچو تو اہلیلجی شکل بن جائے گی۔

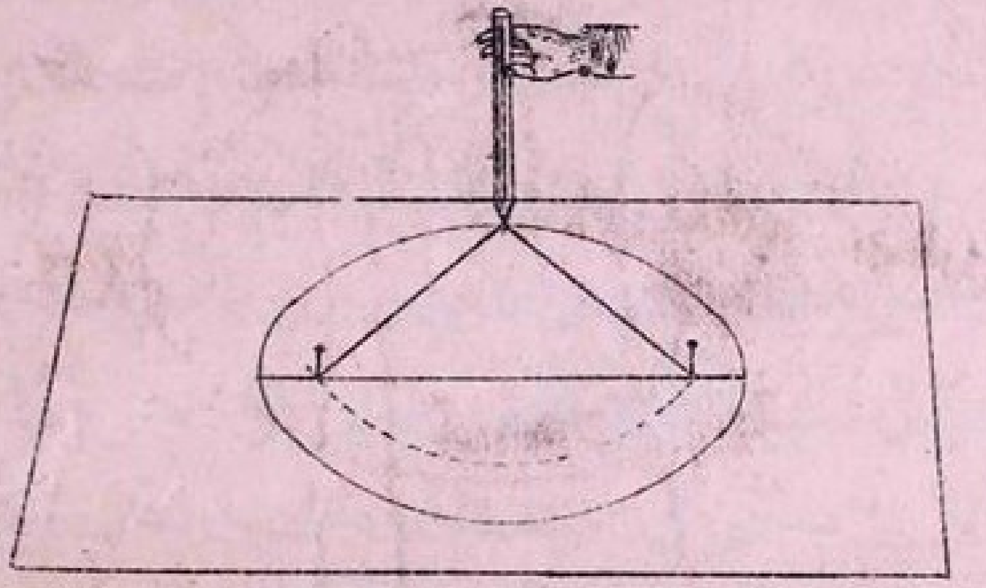

(۲)

پھر جس طرح ایک دائرہ چھوٹا بڑا بن سکتا ہے اسی طرح آلپینوں کے قرب و بعد اور تاگے کو چھوٹا بڑا کرنے سے مختلف ناپ کے اہلیلجی دوائر بن جائیں گے۔

ریاضی کے نقطۂ نظر سے ان دونوں مقامات کو جہاں آلپینیں نصب کی گئی تھیں فوسائی (Foci) اور عربی میں محترقین کہتے ہیں اور ان ہی دونوں نقطوں میں سے کسی جگہ آفتاب کا ہونا ضروری ہے۔

چنانچہ اسی اصول کی بنا پر کیپلر نے پہلا قاعدہ یہ مقرر کیا کہ:۔

ہر سیارہ آفتاب کے گرد اہلیلجی دائرہ بناتا ہے اور آفتاب کا دونوں محترقین میں سے کسی ایک محترق پر ہونا ضروری ہے۔

جب یہ متعین ہو گیا کہ تمام سیارے آفتاب کے گرد دائرہ اہلیلجی بناتے ہیں تو اب دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنی گردش کس طرح پوری کرتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر سیارہ ایک مدت معینہ کے اندر اپنی گردش دوری پوری کر لیتا ہے لیکن یہ

خیال کرنا کہ وہ ایک ہی رفتار سے چلتا ہے درست نہیں۔ مثلاً زمین ۳۶۵ ¼ دن میں آفتاب کے گرد اپنی گردش پوری کر لیتی ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ وہ ہر وقت اور ہر جگہ ۱۸ میل فی سکنڈ کی رفتار سے گذرتی ہوگی غلط ہے۔

اگر گردش بالکل دائرہ کی صورت میں ہوتی تو سیارہ کی رفتار یقیناً ہر وقت ایک ہی رہتی کیونکہ آفتاب عین مرکز پر واقع ہوتا اور اس کی کشش محیط یعنی دائرے کے ہر نقطہ پر یکساں ہوتی، لیکن چونکہ سیارے اہلیلجی دوائر بناتے ہیں اور آفتاب محیط سے دور و نزدیک ہوتا رہتا ہے، اس لئے اسی لحاظ سے سیارہ کی رفتار بھی سریع و بطی ہوتی رہتی ہے۔

(۳)

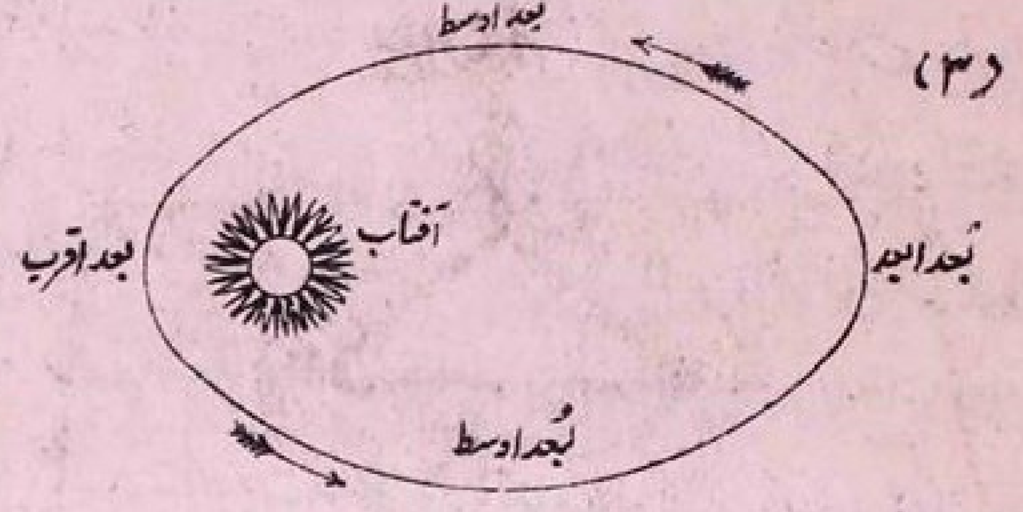

اس شکل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اہلیلجی دائرہ بنانے کی صورت میں سیارہ ایک جگہ آفتاب سے بہت قریب ہو کر گذرتا ہے، ایک جگہ بہت بعید ہو کر اور دو نقطہ ایسے ہیں جنہیں ہم بعد اوسط کہہ سکتے ہیں۔

پھر چونکہ آفتاب کے بعد و قرب کو کشش میں بڑا دخل ہے، اس لئے ظاہر ہے بعد ابعد میں سیارے کی رفتار بہت کم بعد اوسط میں متوسط اور بعد اقرب میں بہت زیادہ ہوگی۔ یہ مسئلہ ریاضی کی مدد سے بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

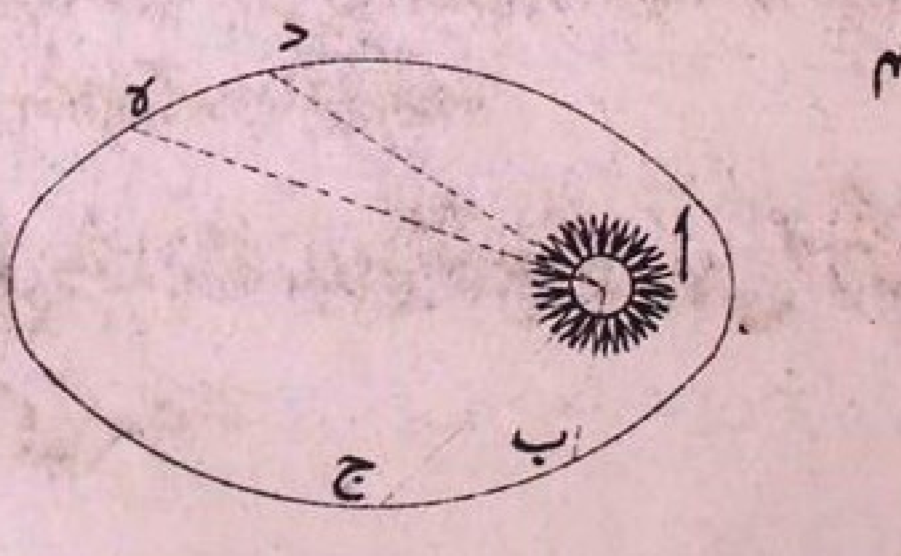

شکل مذکورہ بالا میں ایک سیارہ کی گردش اہلیلجی دکھائی گئی ہے جس میں ا مقام آفتاب ہے۔ محیط میں سے ب ج اور د ہ دو قوس لیلئے گئے اور ان سے مرکز آفتاب تک ایک خط کھینچ دیا گیا۔ فرض کرو کہ ا ب ج

کا رقبہ ا د ہ کے برابر ہے تو ایک سیارہ ان دونوں فاصلوں کو ایک ہی وقت میں طے کرے گا، لیکن ظاہر کہ قوس ب ج جو قریب آفتاب کے ہے قوس د ہ سے بڑا ہے، اس لئے کیپلر کا دوسرا قاعدہ یہ قرار پایا کہ:-

ہر سیارہ آفتاب کے گرد اس طرح حرکت کرتا ہے کہ اگر اس سے ایک خط مستقیم آفتاب تک کھینچا جائے تو وہ خط برابر اوقات میں برابر رقبوں سے گذرے گا۔

ان دونوں قاعدوں کے ساتھ کیپلر نے ایک تیسرا قاعدہ اور قایم کیا جس سے دو مختلف سیاروں کی گردش کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اس کے سمجھنے سے قبل یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ بعد اوسط کسے کہتے ہیں۔ یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہلیلجی گردش میں سیارے کا فصل آفتاب سے گھٹتا بڑھتا رہتا ہے اور اسی جگہ شکل نمبر ۲ میں بعد اوسط کی جگہ بھی بتادی گئی یعنی وہ بعد جو مدار کے تمام مختلف فاصلوں کا اوسط ہو۔ بعد اوسط اور بعد اقرب کو جمع کرکے نصف کردینے سے بعد اوسط معلوم ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ہر سیارہ ایک مدت متعینہ کے اندر اپنی گردش پوری کر لیتا ہے۔

جب یہ دونوں باتیں ذہن نشین ہو جائیں گی تو کیپلر کا تیسرا قاعدہ سمجھ میں آجائیگا جس کے ذریعہ سے مختلف سیاروں کے بعد اوسط اور مدت گردش کی نسبت باہمی معلوم ہو سکتی ہے۔ وہ قاعدہ یہ ہے کہ:-

دو سیاروں کی مدت گردش کا مربع انکے ابعاد اوسط کے کعب کی نسبت سے ہوتا ہے۔

چونکہ کیپلر کو معلوم تھا کہ ہر سیارہ کی مدت گردش مختلف ہے اور اسی کے ساتھ وہ اس سے بھی آگاہ تھا کہ جس قدر بعد اوسط زیادہ ہوگا، اسی قدر مدت گردش زیادہ ہوگی، اس لئے اس نے یہ نسبت سمجھ لی۔ اُس نے یہ نہیں کہا کہ مدت گردش بعد اوسط کی نسبت سے ہوگی، کیونکہ اس صورت میں اگر کسی سیارے کا بعد اوسط دوچند ہوتا تو مدت گردش بھی دوچند قرار پاتی حالانکہ بعض دور کے سیارے ایسے ہیں جو سہ چند مدت میں اپنی گردش پوری کرتے ہیں ذیل کی مثال سے یہ قاعدہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

فرض کرو کہ زمین کا بعد اوسط ایک ہے اور مدت گردش ۳۶۵ ر ۳، اسی طرح زہرہ کا بعد اوسط ۷۲۳ ر ۵ اور مدت گردش ۲۲۴ و ۷ ہے۔ اس لئے ۳۶۵ و ۳ کے مربع ۲۲۴ و ۷ کے مربع میں وہی نسبت ہوگی جو ان

دونوں کے ابعاد اوسط کے کعب میں ہے۔

اگر زہرہ کی مدت گردش نہ معلوم ہوتی یا اُس کا بعد اوسط غیر معلوم ہوتا تو بھی وہ دریافت ہو سکتا تھا اور اسی طرح ہر سیارہ کی مدت گردش اور اس کا بعد اوسط معلوم کیا جا سکتا ہے۔

یہ تھے کیپلر کے وہ تین اصول جنہوں نے نظام شمسی کو ایک منضبط صورت میں پیش کیا، لیکن کیپلر یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور گردش اجرام کے متعلق جو تین اصول اُس نے قایم کیے ہیں وہ کس سبب کے ماتحت منضبط ہوتے ہیں اس مسئلہ پر سب سے پہلے نیوٹن نے توجہ کی اور اُس نے ثابت کیا کہ یہ سب کچھ اجرام کی باہمی تجاذب و کشش کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی کرہ، جو سما میں معلق ہے اور اس پر کسی دوسرے کرہ کا کوئی اثر نہیں ہے تو وہ کسی قوت سے حرکت دیئے جانیکے بعد فضائے کائنات میں چل پڑیگا، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ وہ اپنا راستہ کس طرح متعین کرے گا، جس وقت ایک پتھر پھینکا جاتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فضا میں وہ ہمیشہ ایک منحنی خط بناتا ہے،" اس لئے ہم اس کرہ کے متعلق بھی خیال کر سکتے ہیں کہ وہ بھی اپنا مدار منحنی خط پر قائم کریگا، لیکن یہ خیال غلط ہوگا کیونکہ زمین پر جو پتھر ہم پھینکتے ہیں اس پر خارجی قوتیں اپنا اثر ڈالتی ہیں برخلاف فضائے بسیط کے کہ وہاں اوپر، نیچے، پست و بلند کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ اس لیے جب ہم یہ تسلیم کریں گے کہ کوئی قوت کشش کرہ متحرک پر کام نہیں کر رہی ہے تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑیگا کہ وہ خط مستقیم میں حرکت کر رہا ہے لیکن چونکہ ان کی حرکت دائرہ دار ثابت ہو چکی ہے،" اس لئے یہ بھی ماننا پڑیگا کہ کوئی قوت ایسی موجود ہے جو انہیں خط مستقیم سے منحرف کرکے اندر کی طرف مائل کئے ہوئے ہے اور یہی وہ قوت ہے جسے جذب و کشش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

نیاز

تصحیح

اپریل نمبر میں، ۹ صفحہ پر حضرت نظر کی غزل کے دوسرے شعر کا پہلا مصرع غلط چھپ گیا ہے۔ براہ کرم حسب ذیل تصحیح کر لیجئے۔

دیکھا ہے جب سے تم کو وہ عالم نہیں رہا

ایڈیٹر

لالہ رخ

(بہ سلسلۂ اشاعت ماسبق)

اتفاقاً، فضل الدین پر اس سفر میں چند غیر معمولی حادثات گذر گئے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہوئی کہ جس محکمہ کے ذمہ ڈاک رسانی کا انتظام تھا، اس میں کچھ ایسی ابتری پیدا ہوگئی کہ مرگانون کے آم جو شاہی دسترخوان کے لئے روزانہ آیا کرتے تھے، وقت پر نہ پہونچ سکے اور کچھ چینی کے برتن جو نہایت نادر و بیش قیمت تھے اور قدیم شاہانِ چین کے استعمال میں رہ چکے تھے، خادموں کی غفلت سے ٹوٹ گئے، ان سب پر طرہ یہ ہوا کہ باورچی نے ایک دن کھانے میں بجائے سیاہ مرچ کے سرخ مرچ ڈالدی۔ ان تمام اسباب کی موجودگی میں بآسانی اندازہ ہوسکتا ہے کہ فضل الدین کی تنقید کس قدر دقیق ہونی چاہیے، چنانچہ جب ابن مقنع کا فسانہ ختم ہوا تو فضل الدین نے اپنے مرواریدی تسبیح کے دانے جلد جلد گراتے ہوئے کہا:۔

"اس نوجوان شاعر کی مثنوی کے متعلق کوئی رائے قایم کرنے اور اس پر تنقید کرنیکے لئے ضروری نظر آتا ہے کہ سب سے پہلے اس قسم کے افسانوں پر جو اب تک ۔۔۔۔"

شہزادی لالہ رخ قطع کلام کرکے کہنے لگی "میرا خیال ہے کہ ہم اس کے مستحق نہیں ہیں کہ آپ کو اس قسم کی تمام تصانیف پر تبصرہ کرنے کی تکلیف دیں، جو اب تک لکھی گئی ہیں، البتہ جو مثنوی ہم نے ابھی سنی ہے، اس پر آپ کی رائے کا اظہار ہم سب کیلئے غالباً سودمند ثابت ہوگا!"

فضیلت مآب نقاد، شہزادی کے اس فرمان پر کچھ کبیدہ ہوا، کیونکہ وہ اپنے فضل و کمال کا جوہر دکھانے سے روک دیا گیا تھا، تاہم اس نے اس مثنوی کے متعلق، اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا:۔

"اگر میری فہم غلطی نہیں کرتی، تو اس فسانہ کے مخصوص اشخاص میں ایک وہ بدصورت شخص ہے جس کا چہرہ نقاب کے اندر پوشیدہ ہے، دوسری ہستی ایک نوجوان لڑکی کی ہے جو ایک وقت ذی ہوش نظر آتی ہے اور دوسرے وقت مسلوب الحواس۔ یعنی شاعر اپنی مرضی کے مطابق کبھی اُسے ذی فہم اور صائب رائے دکھا دیتا ہے اور کبھی دیوانہ و بے عقل، تیسرا وجود ایک نوجوان کا ہے، جس کی سر پر ایک بدنما بخاری وضع کی ٹوپی ہے۔ یہ نوجوان، اس کریہ المنظر انسان کی دعوائے پیغمبری کو

تسلیم کرکے اُس کا پیرو بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایسے مواد سے کیونکر ایک عمدہ مثنوی کی توقع قایم کی جاسکتی ہے۔ ان میں، ہمر ایک سے مباحثہ کرنے کے بعد ہمارا القاب پوش دوست، آتش سیال کے ایک حوض میں غوطہ زن نظر آتا ہے۔ وہ دوشیزہ ایک فصیح و بلیغ تقریر کرتے کرتے جان دے دیتی ہے اور عاشق دل گرفتہ اپنی عمر طبعی تک اس آرزو پر زندہ رہتا ہے کہ کسی دن وہ اس کی روح کو خواب میں دیکھ لے۔ آخر کار وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے اور مر جاتا ہے۔

غالباً تم سب اس سے متفق ہوگے کہ یہ خلاصہ غلط نہیں ہے؟

ہر چند مثنوی کا طرز ادا دلکش ہے لیکن اس میں نہ تو کوئی ادیبانہ صنعت ہے کہ تخیل کی عمومیت کا بدل ہو سکے اور نہ کوئی عبارت آرائی ہے، جس کے باعث وجدان معنی خیز اور حسین بن جاتا ہے، اب رہا شاعرانہ پہلو، سو اس کے متعلق اگر زیادہ بُرائی نہ کی جائے تو بھی مکروہ و قابل نفرت کہدینا بیجا نہ ہوگا۔ اس میں نہ تو فردوسی کی سی الہامی روانی ہے، نہ حافظ کی فدرتی شیرینی اور نہ سعدی کی بے مثال سلاست۔"

فضل الدین نے جو نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ تمام اہلِ محفل مصروف خواب ہیں حتیٰ کہ شمع کے شعلے بھی سو جانے کیلئے آمادہ ہیں۔ وہ اس حرکت پر نہایت برہم ہوا، مگر مجبور تھا۔ آخر کار اس نے اپنے خطبہ کو ان الفاظ پر ختم کیا:۔

"باوجود ان خیالات کے جو میں نے ظاہر کئے اور جو ایک تنقید کرنے والے کا فرض تھا میری یہ خواہش نہیں ہے کہ نوجوان شاعر کی دلشکنی کا باعث ہوں اور اس کی ہمت کو پست کروں۔ البتہ اگر وہ اپنا انداز بیان تبدیل کر دے تو میں خوش ہونگا۔"

لالہ رُخ نے فرامرز کی مثنوی کو بے حد پسند کیا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ اس سے کسی دوسرے فسانہ کی فرمائش کرے، لیکن اس کی جرأت سے قاصر نظر آئی۔

اس کے بعد قافلہ ایک وادی میں پہونچا۔ یہ وہ مقام تھا جو چند ہی سال قبل لالہ رُخ کی بڑی بہن شاہزادی روشن آرا کے سفر کشمیر کے وقت آراستہ کیا گیا تھا۔ شاہزادی اس مقام کو دیکھکر بہت متاثر ہوئی اور بولی:۔

"میرا خیال ہے کہ یہ مقام بہار کی دیوی کا مسکن ہے، جس کی پرستش معابد خطا میں کی جاتی ہے یا پھر یہاں وہ پریاں رہتی ہیں جن کی غذا صرف نکہت گل ہے۔"

فرامرز، جس کی نظر میں لالہ رُخ ہی بہار کی دیوی تھی اور پری بھی، کہنے لگا:۔

"مجھے ایک پری کا چھوٹا سا قصہ یاد ہے، اگر شاہزادی کا ایما پاؤں تو عرض کروں۔"

فضل الدین نے کچھ نہ کہا اور شاہزادی لالہ رُخ نے ایک تبسم کے ساتھ فرام رز کی آمادگی کو بہت پسند کیا اور فرام رز نے ستار اُٹھا کر اس طرح سُنانا شروع کیا:۔

بہشت اور پری

(۱)

صبح کی نورانی فضا میں دروازہ عدن پر ایک پری حالتِ حزن و ملال میں کھڑی ہے۔ بہشت کا دروازہ کسی قدر کھلا ہوا ہے، فردوس کے چشموں کی روانی، اس کے سامعہ کو مسحور کر رہی ہے اور وہاں کی نورانی صباحت کا انعکاس اُس کے بازوؤں کو تابناک بنا رہا ہے پری بے انتہا غمگین و ملول ہے اور اس کے بلوری رخساروں پر آنسو جاری ہیں، وہ نیم وا دروازہ کے اندر دیکھتی اور خیال کرتی ہے کہ "وہ پاک روحیں جو عدن کے اندر مصروف گلگشت ہیں، کس قدر خرم و مطمئن ہیں اور اس بہار رنگ و بو میں، جس کے لئے افسردگی و پژمردگی کا کوئی مفہوم نہیں ہے وہ کس لطف سے ہمیشہ مقیم رہیں گی، ہر چند پرستان کے باغات و قصور بہت اچھے ہیں، ارض و بحر کی تمام پر فضا مناظر بھی میری ملکیت میں ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خلد کا ایک غنچہ بھی دنیا کی تمام بہاروں کو افسردہ کر سکتا ہے کشمیر کی جھیلوں کی درخشانیاں، اس کے جزیروں کی آئینہ سامانیاں اور چشموں کے شیریں نغمے گو پرلطف ہیں، تبت کی رود زریں کی روانی بے حد تک تابناک ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ سلسبیل و تسنیم کی روانی کے سامنے ان خوبیوں کا ذکر کرنا ہی کفر ہے، ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک پرواز کرتے رہنا، ایک دنیا سے دوسری دُنیا تک سیر و سیاحت پر قادر ہونا ہر خطہ اور ہر فضا کی مسرتیں اپنے لئے جذب کر لینا گو نہایت پرلطف بات ہے، لیکن یہ سب بہشت کے ایک لمحہ کے بھی برابر نہیں ہو سکتے۔"

باب النور کے محافظ، رضواں نے اُسے زار و قطار روتے دیکھا، کسی قدر قریب ہو کر اس کا مغموم گیت سُنا اور جذبہ رحم سے ایک آنسو اُس کی آنکھ میں آ کر اس طرح ٹھہر گیا، جس طرح بہشت کے فوارہ سے کوئی قطرہ اُڑ کر گل نیلم کی پنکھڑی پر قایم ہو جاتا اور جھلکتا رہتا ہے۔ رضواں نے اس پیکر حسرت سے کہا:۔

"اے خطا کار مگر حسین نسل کی جمیل ترین دوشیزہ! تیرے لئے اب صرف ایک ہی امید باقی رہ گئی ہے

کتاب تقدیر میں درج ہے کہ پری اگر وہ تحفہ لائے جو خدا کو بہت پسند ہے تو اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ اس لئے جا، اور اس تحفے کی تلاش کر، تاکہ وہ تیرے گناہ کا کفارہ ہو سکے۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے جب گنہگار ہستیوں کی خطائیں معاف ہو جاتی ہیں اور میں انہیں بہشت کے اندر جاتے ہوئے دیکھتا ہوں۔"

جس طرح شہابِ ثاقب نہایت سرعت کے ساتھ آفتاب میں جذب ہو جاتا ہے، جس طرح رات کی تاریکی میں کوئی ستارہ ٹوٹ کر نگاہوں سے غائب ہو جاتا ہے، اسی طرح وہ پری بھی سرعت پرواز کے ساتھ سقفِ نیلمی سے اتری اور صبح کے اولین تبسم کی روشنی میں بسیط فضائے ارض کو دیکھنے لگی، وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی کہ اس تحفہ کو جو خدا کے نزدیک بہت محبوب ہے، کہاں تلاش کرے، اس نے خیال کیا:۔

"چہل مینار کے ستونوں کے نیچے تابناک عقیق کے دفینے میرے علم میں ہیں، عرب کے جنوبی ساحلوں کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے جزائر عنبریں میری نگاہ میں ہیں، میں اس مقام سے بھی واقف ہوں جہاں جامِ جمشیدی چھپا ہوا ہے، لیکن میں جانتی ہوں کہ اس قسم کے تحفے مقبولِ عرش نہیں ہو سکتے پھر وہ جوہرِ تاباں کہاں مل سکتا ہے، جو بارگاہ خداوندی میں پیش کیا جا سکے؟"

ہنوز وہ اسی فکر میں تھی کہ اسکی نظر خطۂ ہندوستان پر پڑی، جہاں کی ہوائیں روح افزا ہیں، جسکے سمندر کی گہرائیوں میں عنبر کا فرش ہے، جس کے ساحلوں کی دیواریں مونگے کی ہیں، جہاں شعاعِ خورشید میں غسل کرنیوالی پہاڑوں کے نیچے ہیرے کی کانیں جگمگاتی رہتی ہیں اور جس کے چشمہ ہائے رواں کی موجوں میں سونا حل کر دیا گیا ہے، لیکن آج اس کے دریاؤں کا رنگ قرمزی ہے، انسانی خون سے چشمے رنگین ہو رہے ہیں اور باغات سے اس وقت موت کی بو آ رہی ہے اور ہر اس سانس میں جو سطحِ زمین سے بلند ہو رہی ہے۔ انسانی قربانی کی بو شامل ہے۔

پری اس منظر خونیں پر ایک نگاہ ڈالتی ہے اور دیکھتی ہے کہ ایک بہادر کے ہاتھ میں تلوار کا صرف لالہ گوں دستہ رہ گیا ہے اور اس کے ترکش میں صرف ایک تیر باقی ہے۔ ایک پُر غرور آواز اُس سے کہتی ہے:۔

"اپنی جان کا دشمن نہ بن اور موت کے ساتھ کھیلنا پسند نہ کر۔"

سپاہی دریا کے بہتے ہوئے رنگین پانی کو دیکھتا ہے اور اپنا آخری تیر کمان میں جوڑ کر اُس کے جواب میں روانہ کر دیتا ہے، باوجود شست کے صحیح ہونے کے تیر خطا کرتا ہے، اور دشمن اس کو زخمی کر ڈالتا ہے۔ پری اس کو گرتے ہوئے دیکھتی ہے اور آفتاب صبح کی شعاع نہایت خاموشی کے ساتھ اس مقام پر اتر آتی ہے اور قبل اسکے

کہ زخم خوردہ سپاہی کی روح جسم سے رخصت ہو، آخریں قطرۂ خون حاصل کرکے آسمان کی طرف بلند ہو جاتی ہے، اور سوچتی جاتی ہے کہ :-

"خدا کرے یہی وہ تحفہ ہو، جس کے باعث بابِ النور پر میرا خیر مقدم ہو سکے۔ ہر چند کہ جنگ کے میدانوں میں بہہ جانے والا خون اکثر نجس و آلودہ ہوتا ہے، کیونکہ خود غرضی و طمع اس کی محرک ہوتی ہے لیکن جو قطراتِ خون، آزادیِ وطن کے لئے اور وطن کی حمایت میں بہائے جاتے ہیں، وہ ضرور مقدس و مقبول ہوتے ہیں۔ یہ خون، وہ پاک خون ہوتا ہے، جس کے شامل کر دیئے جانے سے تسنیم و سلسبیل کا صفا بخش پانی بھی آلودہ نہیں ہو سکتا۔ پھر دنیا میں اگر کوئی شے ایسی ہو سکتی ہے جسے خداوندِ عالم پسند فرمائے تو وہ یہی قربانی ہے جو حریت کی دیوی پر چڑھائی جاتی ہے۔"

بہشت کا دروازہ آجاتا ہے اور جب وہ اپنے اس ہدیہ گراں قیمت کو جذبۂ امید و مسرت کے ساتھ رضواں کے سامنے لاتی ہے تو وہ کہتا ہے :-

"کوئی شک نہیں کہ پرستارانِ وطن کے پُر شہامت جذبہ کی آسمانوں میں عزت کی جاتی ہے، مگر افسوس ہے کہ جنت کا بلوریں حلقۂ در اسی طرح قایم ہے اور ذرا حرکت نہیں کرتا۔ لہٰذا تجھے اس سے بھی زیادہ مقدس چیز کی تلاش کرنی چاہیئے جو تیرے واسطے بابِ جناں کو کھول سکے۔"

(۲)

پری یہ سن کر بہت افسردہ ہوئی اور پھر زمین کی طرف لوٹی۔ اس مرتبہ اس کا رخ، افریقہ کے دور افتادہ جنوبی گوشہ کی سمت ہو جاتا ہے اور جبلِ قمر کے دامنوں میں چشمۂ مصر کی امواج پر اس کے بازو منعکس ہوتے ہیں۔ نیل کا یہ منبع، بنی آدم کی نگاہوں سے مخفی، تنہا و غیر آباد جنگلوں کے وسط میں واقع ہے اور دریا کی دیویاں اس گہوارۂ نیل کے گرد رقص کیا کرتی ہیں۔ وہ روحِ متجسس ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی اس فضا میں چکر لگانے لگتی ہے۔ ایک وادی میں وہ قمریوں کو مصروف شیون دیکھتی ہے اور تمام تر اس طرف متوجہ ہو جاتی ہے، دوسرے مقام پر وہ ماہی گیر ونکا غول دیکھتی ہے جو نیلگوں پانی کو متحرک کر رہا ہے، جن کے سفید ملبوس کو رخصت ہونے والے چاند کی روشنی سفید تر بنا رہی ہے۔

ان روح افزا وادیوں کے پھلوں کا ماہتاب کی روشنی میں ڈوب ڈوب کر سنہرا ہو جانا، خرما کے درختوں کا ایک مغلوبِ خواب پُر شباب دوشیزہ کی گردن کی طرح جھک جانا، اچھوتے کنولوں کا تمام شب اپنے حُسن

صبح کو غسلِ شبنم دیتے رہنے کے بعد، بیدار ہوکر آفتاب کی سب سے پہلی کرن کا انتظار کرنا یہ سب وہ مناظر تھے جن سے پری بہت متاثر ہوئی۔

ٹھیک اسی حالت میں ایک شاداب درختِ نارنج کے سایہ میں، جس کے پھول اور پھل ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جنبش میں آجاتے تھے، اس پری کے کان میں کراہ کی آواز آتی ہے۔ شاید یہ کراہنے والی ذات اس عالمِ سکوت میں اس خاموش مقام پر موت کی تلاش میں آپہونچی تھی۔ وہ ہستی جس کی زندگی میں، اس کی ہر ہر حرکت و عمل کی مشایعت میں، صدہا قلب مضطرب ہوجایا کرتے تھے، اس وقت اس طرح تنہا چھوڑ دی گئی تھی، گویا دنیا میں اس کا کوئی چاہنے والا نہیں، کسی کو اس کے ساتھ تعلق نہیں اور اس کے آخری سانسوں کو دیکھنے والی، اس پر دو آنسو بہانیوالی کوئی آنکھ نہیں ہے۔ اُف کیسا حسرت خیز منظر ہے! کوئی نہیں، جو اس وقت اس کے پاس ہوتا اور جو آگ اس کے سینہ کے اندر لگی ہوئی ہے اُسے اس جھیل سے پانی کا ایک قطرہ لاکر جو سامنے اپنی خنکی و صفائی کو پیش کررہی ہے بجھا دیتا۔

کون جان سکتا ہے کہ اس بیکس جوان کے یہ لمحاتِ آخریں، صرف ایک خیال کی لذات و مسرت سے آباد ہیں اور اس کی آمادۂ مفارقت روح پر اپنا سکون نازل کر رہے ہیں۔ اس کی یہ آخری سانسیں مطمئن سانسیں کہی جاسکتی ہیں، کیونکہ اسے اپنی اس بیکسی کی پروا نہیں اس لئے کہ وہ دوشیزہ جس سے وہ ایک عمر سے محبت کرتا ہے اور ہمیشہ اپنی کہکر پکارتا تھا، اس ہلاکت نیم شبی کی اذیتوں سے محفوظ تھی، اپنے خاندان کے ساتھ شاہانہ مکان میں فواروں کے سیمیں تقاطر سے جاری ہونیوالی روح فزا خنکی سے سکون حاصل کر رہی تھی۔

ملفوفِ سحاب چاند کی روشنی میں، دور سے ایک جسم متحرک نظر آتا ہے جو نہایت آہستہ آہستہ اس نزدگی بار گنج کی طرف بڑھ رہا ہے یہ جسم نزدیک پہنچکر ایک پرشباب دوشیزہ کی شکل میں منتقل ہوجاتا ہے جس کے رخسار یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اندر گل تر مستور ہیں۔ یہ دوشیزہ اسی جاں بلب نوجوان کی منسوبہ ہے اور اپنے حبیب کے پہلو میں ہلاک ہوجانے کو ساری دنیا کے حصول پر ترجیح دیتی ہے۔ یہ لڑکی بیتابانہ اپنے بازوؤں کو اس کی گردن میں ڈال دیتی ہے، اپنے رخساروں کو اس کے رخساروں پر، اور اپنی سیاہ زلفوں کو، جنھیں وہ جھیل کے پانی میں ڈبو کر لائی تھی، اس کی ملتہب ابروؤں پر رکھ دیتی ہے۔

اف! کس قدر حسرت خیز نظارہ ہے وہ اس حالت کی تمنا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مرنے سے قبل ایک ساعت ایسی بھی آئیگی جب اس کی جان و روح کی ملکہ کے بازو اس کی گردن میں ہونگے۔

ہو جائیں گے۔ لیکن وہ جوان پھر ایک مرتبہ اپنی حالتِ زار کا احساس کر کے احتراز کرنا چاہتا ہے گویا اس دوشیزہ کے لبہائے مرجاں رنگ میں جو اس وقت اس درجہ بے خطرانہ مبش کر دیئے گئے ہیں، تمام عالم کا سم قاتل بھر دیا گیا ہے۔ اس صورت اجتناب نے اس لڑکی پر قیامت برپا کر دی اور اس نے روتے ہوئے کہا:۔

"آہ اس فضا میں جہاں تم سانس لے رہے ہو، میرا سانس لینا پسند نہیں کرتے۔ یہ ہوا جو ہر چند ہلاکت بار ہے مجھے نوشدارو کے اثر سے لبریز نظر آتی ہے، کاش میرا خوں شدہ دل اس زہر کے لئے تریاق ہو سکتا، لیکن میرے پاس تو صرف یہ آنسو ہیں۔ ہاں میرے گریۂ محبت کا تقاطر ہی میرا سرمایۂ حیات ہے، اور یہی تمہارے مرض کا علاج ہے۔ باور کرو کہ ابھی وقت ہے کہ یہ چشمۂ حیات تمہیں سیراب کر سکے ورنہ اس کے خشک ہو جانے پر یہ سارا نظام بدل کر رہ جائیگا۔ تم مجھ سے اظہار نفرت نہ کرو۔ اپنا منہ نہ پھیرو، کیا میں تمہاری نہیں ہوں، تمہاری عروس محبت نہیں ہوں؟ میں تو تمہاری نگاہ لطف کا ایک ہدیۂ مقبول ہوں، جس کے لئے دنیا میں اور اس کے بعد بھی، سوائے تمہارے پہلو کے کوئی مقام راحت و سکون نہیں۔ میری جانب دیکھو۔ قبل اس کے کہ میں دل کی آتش سوزاں سے خاکستر ہو جاؤں، تمہارے سرد ہونٹوں کی پاکیزہ زندگی جبتک قائم ہے مجھے بھی اسی زندگی کا شریک رہنے دو!"

فضا کی سمیت آلودہ ہوا اس کے چراغ حیات و محبت کو بھی گل کر دینا چاہتی ہے، وبا کا زہرناک تنفس اس کی آنکھوں کے شیریں نور کو ایک فشار دے دیتا ہے، اس کا دل بیٹھنے لگتا ہے اور وہ بیہوش ہو جاتی ہے۔

تپش و کرب کا ایک خفیف اظہار کرنے کے بعد درد، درد کی حد سے گذر جاتا ہے اور ٹھنڈا پڑ جاتا ہے دوشیزہ آنکھ کھولتی ہے۔ پھر ایک بوسہ اپنے محبوب کا لیتی ہے اور فرشتۂ موت بوسہ ہی کی شکل میں اُن سے ملاقی ہوتا ہے اور ایک وداعی آہ کے ساتھ اس شمع کا شعلہ ماتمی لباس اختیار کر لیتا ہے۔

آمادۂ سفر روح کے لبوں سے، جس کی وفاداری دنیائے نسائیت کے لئے بہترین نمونہ ہے، آخر میں "آہ وداع" سنتے ہی پری کہتی ہے:۔

"آرام کر، آسودۂ خواب ہو جا اور دنیائے تنفر میں ہمیشہ کے لئے راحت گزیں رہ!"

ان الفاظ کی شکل میں اس پری نے فضا پر ایک جلوہ تنفس ساری کر دیا اور اپنے طرۂ تابناک کی حرکت سے

اُس تاریک کنج کو روشن بنا دیا جس میں یہ دونوں بے جان پڑے تھے۔ ان کے چہرے نورانی تھے، اور انکی روحیں مطمئن!

افق پر اب نمودِ صبح کا رنگ انفعال چڑھ جاتا ہے اور پری پاک جذبۂ محبت کی بے مثال قربانی کی یادگار، یعنی اک بیش بہا "آہ و وداع" لیکر آسمان کی جانب بلند ہو جاتی ہے۔ اس دفعہ غرور مسرت سے اس کا دل غیر معمولی طور پر متحرک ہے، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس سے بہتر تحفہ دنیا کا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اُسے یقین ہے کہ یہ تحفہ خدا کے حضور مقبول ہوگا۔ اور وہ بہشت میں داخل ہو جائے گی۔ مسرور و مفتخر پری، دروازہ بہشت پر پہونچتی ہے اور ایک پر معنی تبسم کے ساتھ اپنا تحفہ رضواں کے سپرد کر دیتی ہے لیکن، افسوس، اُس کی یہ امید بھی یاس ہی ثابت ہوئی، بامنشائے قدرت اب بھی اس کی آرزو کے مخالف نظر آیا۔ رضواں نے اس کا یہ تحفہ لیا اور نیم وا دروازہ جنت کو بند کرکے بولا "ابھی نہیں۔ بے شک اس غم نصیب دوشیزہ اور بد قسمت نوجوان کا فسانہ نہایت دلگداز ہے اور وہ لڑکی بیشک وفادار تھی، مگر اے پری، دیکھ کہ حلقۂ بلوریں اب بھی متحرک نہیں! پس وہ چیز جو تیرے لئے دروازہ جناں کو کھول دے اس "آہ" سے بھی زیادہ مقدس ہونی چاہیئے۔"

(۳)

نواحِ شام کے وسیع گلاب زاروں پر شام کی شفقی روشنی چھائی ہوئی ہے لبنان کی بلندی پر قرص آفتاب بصد شان دلربائی اپنا تاج زریں نمایاں کر رہا ہے، وہی لبنان جس کی چوٹیاں سرما میں یخ سے سفید ہو جاتی ہیں۔ اور گرمی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پر فضا وادیوں میں بہار استراحت پذیر ہے، اور کوئی اچھا خواب دیکھ کر پڑی مسکرا رہی ہے۔

اس آنکھ کے لئے جو، جو سما میں معلق ہو کر اس طلسمی منظر کا تماشا کر رہی ہو، اس رنگینی حیات کا نظارہ کس درجہ حسین اور دلفریب ہو سکتا ہے۔

شاداب و رنگین باغات میں، منور چشموں کے کنارے جہاں سر دوں کے کھیت دور تک چلے گئے ہیں، معابد شکستہ کی دیواروں پر بے شمار کبوتروں کے جھنڈ نظر آتے ہیں اور ان کے خوش رنگ اور بیتاب بازو سورج کی قرمزی کرنوں میں اس طرح چمک رہے ہیں گویا وہ قوس قزح کے ٹکڑے ہیں، اس قوس قزح کے ٹکڑے جو صرف پرستان کے پاکیزہ آسمانوں پر ہی طلوع ہوا کرتی ہے۔ لیکن اس بدنصیب پری کی افسردہ دلی کے لئے اس دلکش فضا میں بھی کوئی وجہ شگفتگی نظر نہیں آتی۔ اس کے بازو خستہ ہو چلے ہیں، اور وہ آفتاب کی حالت غروب کو بغور دیکھ رہی ہے۔ تیرگی آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے جس میں ویران معبدوں

ہے کہ بلند ستونوں کا سایہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا زمانہ نے اپنی رفتار عمر بتانے کے لئے سوئیاں قایم کر دی ہیں۔

لیکن کیا اس شکستہ ایوان خاوری میں کوئی طلسمی جوہر، کوئی حرز سلیمان ایسا مل سکتا ہے، جو اس پری کی آنکھوں کو روشن کر دے، اور اُسے معلوم ہو جائے کہ آفتاب و ماہتاب کے محور میں سمندروں اور خشکیوں کے تہ خانوں میں وہ نایاب شے کہاں پنہاں ہے کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو سکے؟

پری نیچے اترآنا چاہتی ہے، چشم آفتاب اسی درخشانی کے ساتھ نگراں ہے ہنوز وہ سطح زمین تک نہیں پہنچی تھی کہ اُسے دکھائی دیا کہ بعلبک کی وادی میں وسیع فرش گل پر ایک کم عمر بچہ، ایک نیلی لباس والی دوشیزۂ پراں، نقاش فطرت کی اختراع جمیل، یعنی ایک تیتری کے تعاقب میں دوڑ رہا ہے، جو ایک یاسمنی کنج کے اندر رقصاں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایک پھول ہے جس کے پر لگ گئے ہیں، یا کوئی نگینہ ہے جس کے اندر رقص سرایت کر گیا ہے۔

وہ بچہ جب اس شغل سے تھک جاتا ہے تو اپنے خوبصورت اور ننھے سے جسم کو پھولوں پر گرا دیتا ہے اور اپنے چہرے کے لئے پھولوں کا ایک نشیمن بنا لیتا ہے۔

ٹھیک اس حالت میں ایک شخص جو نہایت ماندہ و مضمحل نظر آرہا ہے، اپنے گھوڑے سے اُترتا ہے اور بیتابانہ اس ویران عمارت کے دامن میں بہنے والے چشمہ کے کنارے پہونچکر، پانی پینے لگتا ہے اور جب پانی پی چکتا ہے تو اس حسین بچہ کو دیکھتا ہے۔ پری بھی اس مسافر پر ایک نظر ڈالتی ہے اور اس کے درشت خدوخال میں وہ تمام تاریکیاں پاتی ہے جو کسی بدترین فطرت انسانی میں پائی جا سکتی ہیں اس کی آنکھیں ظلم و بے رحمی کا مسکن نظر آرہی ہیں، عورتوں کی عصمت دری اور مقدس جذبات مذہبی کی توہین و تذلیل اس کے بشرہ کی نمایاں خصوصیت معلوم ہوتی ہے، بیوفائی اور بدعہدی، اس کی پیشانی پر جدا جدا لکھی ہوئی ہیں لیکن اس وقت یہ پیکر معصیت و مجسمۂ گناہ بھی ایک سکون و اطمینان کی حالت میں فرش زمین پر پڑا ہوا اس طفل گلستاں کے کھیل کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ گویا شام کی ٹھنڈی فضا نے اس کے دل میں بھی کچھ نرمی پیدا کر دی ہے۔ با اینہمہ جب اسکی بھیانک آنکھیں اس بچہ کی معصوم و مسرت ناک نگاہوں سے مقابل ہو جاتی ہیں تو محسوس ہونے لگتا ہے کہ دو دو مشعلیں ہیں جو تمام رات ناپاک و خبیثانہ افعال کے لئے روشن رہی ہیں۔

کرۂ درخشاں کے تدریجی غروب کے ساتھ ہی دمشق کے بے شمار مناروں پر سے اذاں کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور وہ بچہ اس پیغام صلوٰۃ کو سنتے ہی پھولوں کے تکیہ سے اپنا سر اٹھاتا ہے اور جانب جنوب کھڑا ہو کر اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دیتا ہے اور اس کے ہونٹھ ایزد ذوالجلال کے نام کی تکرار میں متحرک نظر آتے ہیں۔

اس طفل معصوم کا یہ شغل عبودیت ایک نظارہ تھا جو صرف جنتوں ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اور اگر اس منظر سکون و طمانیت کو ابلیس لعین بھی دیکھ لیتا، تو اپنے گم کردہ سکون پر ایک آہِ تاسف کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ یہی باعث تھا کہ یہ مسافر بھی اس منظر تقدیس کو دیکھ کر اپنے آنسو نہ روک سکا اور عمر گذشتہ کے تمام افعال شنیعہ حافظہ نے اس کے پیش نظر کر دیئے۔ اس نے باوجود سعی و جستجو کے اپنی گذشتہ زندگی کے تاریک طوفان میں ایک لمحہ سکون نہ پایا، اس کے جذبۂ انفعال و تاسف نے اظہار تاثر کا ذریعہ صرف آنسوؤں کو بنالیا۔ نہایت رقت قلب کے ساتھ عجز و فتادگی زا لہجہ میں اُس نے کہا:۔

"ایک وقت مجھ پر بھی ایسا ہی گذر گیا ہے، میں بھی تیری ہی طرح معصوم تھا اور تیری ہی طرح میں بھی اپنے معبود کے سامنے سجدہ میں گر جایا کرتا تھا۔"

شرافت و انسانیت، امید و رجا کے جو جذبات ایک زمانہ سے اسکے اندر نیم مردہ حالت میں تھے، دفعتاً بیدار ہو جاتے ہیں۔ گریہ سے اسکی آواز بلند ہو جاتی ہے۔ وہ روتا ہے اور آنسوؤں کا ایک طوفان جاری کر دیتا ہے۔ جو آنسو عمق دل سے بہ ندامت گناہ میں نکلتے ہیں مقبول ہوتے ہیں۔ ایسی ہی قابل قبول اور عفو طلب روانی اشک میں اپنی بدخطایانہ طمانیت کا اولین احساس ہونے لگتا ہے اور یقیناً ایک گنہگار بھی ہو
پری نے اس شخص کو اشک فشاں دیکھ کر کہا:۔

"یہ ہی وہ قطرہ ہے جو ماہتاب سے ٹپکتا ہے، اور وادی نیل کے طوفان وبا کو دفعتاً معدوم کر دیتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ وہ قطرۂ انفعال و ندامت ہے، جو انسان کی اندرونی وبائے معصیت کو یکسر کالعدم کر کے اسے پاک و مقدس ہستیوں میں شامل کر دیتا ہے۔"

پری اب اس مسافر اور طفل معصوم کو پہلو بہ پہلو مصروف عبادت گذاری دیکھتی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ سورج کی ایک بچھڑی ہوئی کرن گنہگار و معصوم دونوں کے سروں پر یکساں تڑپ رہی ہے۔ وہ آسمان پر حمد و صلوٰۃ کا غل سُنتی ہے کہ ایک خطاکار کی توبہ قبول ہوتی ہے، ایک گناہگار کی نجات ہوتی ہے۔

آفتاب کی آخری ضیائے زریں بھی غائب ہو گئی اور اس کی جگہ ایسی روشنی نمودار ہو گئی جس کی مثال کبھی کسی ستارے کی ضیا مہیا نہیں کر سکتی۔ اس نور سماوی میں اس شخص کے افسردہ رخساروں پر آنسو اس طرح چمکتے ہیں جیسے دن بھر کے مرجھائے گلاب پر شبنم کے قطرے۔ انسانی نگاہیں ممکن ہے کہ اس روشنی کو شہابی ضیا سے تعبیر کریں، لیکن پری جس پر وجد کی کیفیت طاری ہے خوب جانتی ہے کہ وہ روشنی فرشتوں کا تبسم تھا جو انسانی ندامت و توبہ کے مقبول ہونے پر اُن کی مسرات کا ثبوت ہوتا ہے۔ پیکر تلاش، پری اب اپنی مسرت کو

ضبط نہیں کر سکتی تھی، اس لئے وہ جوش میں آکر پکار اُٹھی :۔

"میرا مقصد حاصل ہوگیا۔ اب میرے لئے مسرت ہی مسرت ہے، میں اب داخلِ ارم ہوسکونگی اور اس کا دروازہ اب میرے لئے بند نہ رہے گا۔"

"الوداع! اے پژمردہ ہوجانیوالے پھولو، جو میرے پرستانی ہاروں میں صرف چند لمحات کے لئے تبسم ہوا کرتے تھے، الوداع! کہ اب میرا حصہ تو وہ طوبیٰ ہے جو تختِ الٰہی کے سایہ میں نشوونما پا رہا ہے اور جس کے پھولوں کی ہر پنکھڑی سے حیاتِ تازہ کی مہک بلند ہوتی ہے۔

میرا مقصد حاصل ہوگیا، اب میرے لئے مسرت ہی مسرت ہے، اب میں داخلِ جنان ہوسکونگی اور اس کا دروازہ اب میرے لئے بند نہ رہے گا۔"

جب یہ مثنوی ختم ہوئی تو ناظرِ اعظم فضل الدین نے کہا :۔

"کیا اسی کا نام شاعری ہے، کیا اسی کمزور اور پست تخئیل کو شاعری کہتے ہیں؟ اس قسم کی مجہول و سست بحریں، جن میں یہ مثنوی لکھی گئی ہے، یکسر متروک و مردود ہوجانی چاہئیں کیونکہ موجودہ شاعری کا حشرات الارض کی طرح نشوونما خطرناک ہے۔"

فضل الدین نے یہ دیکھکر کہ اہلِ مجلس پر نیند کا غلبہ شروع ہوگیا ہے، کسی قدر آواز کو بلند کر دیا اور بولا "جو لوگ اپنی وقعت قائم کرنیکے لئے خود تدابیر وضع کرتے ہیں اور جن اختیارات کا وہ اپنے تئیں بزعمِ خود عامل باور کرلیتے ہیں، اور اُن کا نفاذ بھی کرنا چاہتے ہیں اُنکی مثال اس نوجوان وحشی رقاصہ کی ہے، جو محفلِ شاہی میں رقص تو کرتی ہے، مگر فنِ رقص سے مطلقاً واقف نہیں ہوتی اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کے متناسب و خوش وضع لباس و پشواز کے اندر اس کے اعضا مفلوج ہوکر رہ گئے ہیں لہٰذا چونکہ تنقیدِ صحیح کے معیار پر اس پری کا فسانہ جو ابھی بیان کیا گیا ہے پورا نہیں اُترتا، اسلئے وہ غور سے سُنے جانے کا مستحق بھی نہ تھا۔ تاہم زمین سے آسمان تک بار بار تگ و دو کرنے سے جو تحفے اُس نے حاصل کئے، یعنی ایک قطرۂ خون، ایک آہ اور ایک آنسو وہ ایک طفلانہ حرکت نہیں تھی تو کیا تھا؟

تعجب ہوتا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ قطرۂ خون رضوان کے "نورانی ہاتھوں" میں کیونکر دیا گیا اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ "آہ" اور "آنسو" کیونکر لے جائے جا سکتے ہیں۔ الغرض کسی ایسی پری کا

وجود اور اس شاعر کی ہستی، جس نے یہ مثنوی لکھی، دونوں بعید الفہم ہستیاں ہیں۔ مختصر یہ کہ اس قسم کی ناقابلِ اصلاح مزخرفات پر بحث کرنا بھی تضیعِ اوقات ہے۔"

لالہ رخ نے اس ناقد کی سخت نکتہ چینی کو نرم کرنے کی کوشش کی اور بولی کہ:

"شعراء کا طبقہ بہت زیادہ رقیق القلب اور حساس ہوتا ہے، اُن کے کلام وتخیل کی شیرینی و خوبی کو اس قدر شدید تنقید سے ضائع نہ کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ یہ طبقہ کنارِ گنگ پر پیدا ہونیوالی گھاس (خس) نہیں ہے، جسے کوٹ پیس کر اُس کی خوشبو کو اس سے علیحدہ کر لیا جاتا ہے۔"

اس اندازِ بحث نے بھی فضل الدین کے کشیدہ ابرو کی کجی کو دور نہ کیا۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ رواداری فضل الدین کی کمزوریوں میں داخل ہی نہ تھی، وہ مذہب اور ادبیات میں ایک ہی نقطہ پر پہنچکر بحث کرتا تھا اور گو وہ ان دونوں موضوع کی خوبیوں اور نزاکتوں کے سمجھنے سے عاری تھا، مگر اُن کی مخالفت کرنے میں اُستادِ کامل کا درجہ رکھتا تھا۔ بہر حال ان مباحث کے متعلق اس کا جوش و شوق مبالغہ کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔

صبح ہوتے کارواں روانہ ہوا اور لاہور پہونچ گیا، جہاں بے شمار یادگاریں اور مقابر، خانقاہیں اور مساجد اس امر کو ظاہر کرتی ہیں کہ موت کا عالم بھی ایک عالمِ مسرت ہے۔ لالہ رخ کا متخیلہ بھی اس منظر سے بہت متاثر ہوتا اگر اس کے دل پر دوسرے محسوسات کا قبضہ پہلے سے نہ ہو چکا ہوتا۔

یہاں پہونچکر، شاہِ بخارا کا قاصد شاہزادی کے حضور پیش کیا گیا، جس نے عرض کیا کہ بادشاہ خود وادیٔ کشمیر میں رونق افروز ہے اور شاہزادی کی پذیرائی کا انتظام کر رہا ہے۔ اس پیغام نے، جو ایک عروس کے دل کو صرف محبت و مسرت کے تخیل سے لبریز کر سکتا تھا، لالہ رخ کی رگوں میں حرارتِ خون کو برف کی سلاخوں سے بدل دیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ اس کا آرامِ دل ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہے کیونکہ اُسے فرامرز سے محبت ہو گئی تھی اور باوجود کوشش کے بھی وہ اس جذبہ کو اپنے دل سے نکال نہ سکتی تھی۔

نہیں کہا جا سکتا کہ اس موقع پر فرامرز کے دل کی کیا حالت تھی؟ اگر درحقیقت وہی انجذاب مہلک جو لالہ رخ کے دل پر حاوی تھا، اس کے دل کو بھی مسحور کر چکا تھا تو کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ فرامرز کس کلفت و غم میں مبتلا تھا۔

لالہ رخ اپنے تئیں اس آفت سے بچانے کی صرف یہی تدبیر سوچ سکی کہ فرامرز اب اس کے حضور میں پیش نہ کیا جائے۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہر چند وہ دل جو وہ شاہِ بخارا کو پیش کرنے والی تھی افسردہ و شکستہ تو ضرور ہوگا۔

لیکن اس کو وہ کم از کم معصوم ضرور رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اس پر آمادہ ہو گئی کہ محبت کے خواب کو اب یکسر دل سے محو کر دے۔

لاہور میں عروس شاہی کی آمد کا جشن نہایت اہتمام و شوق کے ساتھ منایا گیا اور جب لالہ رخ لاہور سے روانہ ہوئی تو شہر پناہ کے دروازے تک دولتمند اور شرفائے شہر کے کم عمر لڑکے اور لڑکیاں خوبصورت لباسوں میں دورویہ صف بستہ تھے اُن کے سروں پر سنہرے طشتوں میں چاندی اور سونے کے کٹے ہوئے پھول تھے۔ اور جس گروہ کے پاس سے لالہ رخ کا محافہ گذرتا تھا ان کی گردنوں کو جنبش ہوتی، طشت حرکت میں آجاتے اور سنہرے و روپہلے پھول نچھاور کئے جاتے تھے، جنہیں لوگ چن لیتے تھے۔ چند روز تک قافلہ مسلسل منزلیں کرتا ہوا چلا گیا۔ مگر تمام اہل قافلہ کے دلوں سے مسرت مفقود ہو گئی تھی اور ایک اُداسی سی چھائی ہوئی تھی۔ لالہ رخ نے نوجوان فرامرز کو اپنے حضور سے دور رکھنے کے لئے اپنی ناسازیٔ مزاج کا حیلہ وضع کیا، لیکن اُسے جلد محسوس ہو گیا کہ یہ بہانہ غیر ضروری تھا۔

ایک دن شام کے وقت لالہ رخ تازہ ہوا حاصل کرنے کی غرض سے ایک عربی النسل گھوڑے پر سوار ہو کر درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب سے گذر رہی تھی کہ اس کے کانوں میں بانسری کی صدا آئی اور دوسرے لمحہ میں گانے کی آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز کو بخوبی پہچانتی تھی۔ وہ وہاں ٹھہر گئی اور اس نغمۂ ساحر کو سننے لگی:۔

"اگر دوسرے عالم میں محبت کی صداقت و مسرت موجود نہیں ہے تو میرے سامنے اس عالم کا ذکر نہ کر، حوروں کی خوش چشمی پر مجھ پر اثر نہیں ڈال سکتی، اگر دنیا کی بعض قاتل آنکھوں کی طرح زخم پیدا نہیں کر سکتی تو اس کا بیان میرے سامنے نہ کر۔ وہ جو اس دنیا میں محبت کا صحیح احساس رکھتا ہے، بیوفائی اور الم انگیزی کو جان لینے کے باوجود بھی فضائے بہشت کے لئے اپنے اس لذیذ خواب کو خطرہ میں نہ ڈالیگا۔ وہ جو صحرا کی شدت گرمی میں پانی کو خاک میں تبدیل ہوتا ہوا دیکھتا ہے، چشمہ سراب کی جستجو پر اپنے تشنہ کام مر جانے کو ترجیح دیگا۔"

یہ الفاظ تیر بن کر لالہ رخ کے دل میں اُتر گئے، اور جب وہ حسرت و تاسف کے جذبات سے لبریز واپس ہوئی تو اُس نے اپنے تئیں اس تاسف انگیز مگر شیریں حقیقت کے احساس پر مجبور پایا کہ فرامرز کا دل بھی اتنا ہی نشۂ محبت سے سرشار و پامالِ غم ہو چکا ہے جس قدر کہ خود اُس کا۔

دوسرے دن شام کو جہاں قیام ہوا لاہور سے روانگی کے بعد پہلی پر فضا اور راحت آفریں جگہ تھی۔

کمپ کے ایک جانب بڑے بڑے درختوں کا سایہ تھا - اور دوسری طرف شہتوت کے جھنڈ تھے - سبزہ زار کے وسط میں شاہزادی کا خیمہ نصب تھا اور سامنے پاکیزہ و مصفا پانی کا ایک تالاب تھا جس کے چاروں طرف آم کے چھوٹے چھوٹے درخت لگے ہوئے تھے - سطح آب پر سرخ کنول کے صدہا پھول تیر رہے تھے - دوسری جانب کچھ فاصلہ پر ایک عجیب وضع کا ہیبت ناک منظر پیش کرنیوالا گنبد تھا جو اپنی کہنگی کے باعث کسی ایسے مذہب کا معبد معلوم ہوتا تھا جو اب زندہ نہ تھا - یہ معبد ویران اس پر سکون و دلکش مقام کے مقابلہ میں اپنی بیکسی و بربادی کی زبان حال بنا ہوا تھا - اس غیر معروف وضع کی شکستہ تعمیر نے ہر شخص کو حیرت میں ڈالدیا - اور بجائے خود ہر شخص قیاس آرائی میں مصروف ہو گیا - لالہ رخ نے بھی غور کیا، اگر بے نتیجہ - کسی خاتون نے کہا کہ شاید فرامرز اس عمارت کے حال سے باخبر ہو، کیونکہ یہ مقام اس کے وطن کے حدود سے قریب تر ہے - اور ممکن ہے کہ وہ کچھ بتا سکے - چنانچہ فرامرز طلب کیا گیا، جس نے اس عمارت کی حقیقت اس طرح ظاہر کی:-

"یہ ایک قدیم آتشکدہ کے قابل تعظیم آثار ہیں، جسے کئی صدی قبل آتش پرستوں نے بنایا تھا اس کے متعلق مجھے ایک افسانہ یاد ہے اور اگر وقت زیادہ نہیں گذر گیا ہے تو یہ فسانہ سنانیکے لئے میں بخوشی طیار ہوں - بشرطیکہ شاہزادی قبول فرمائیں"

شاہزادی نے بخوشی اجازت مرحمت فرمائی اور شاعر نے "پرستاران آتش" کے فسانہ کی یوں ابتدا کی:-

(باقی) ل - احمد

غزل

اے کہ با چشمانِ مستت ساحری فن آمدی
فرصتت بادا کہ دل را ہوش افگن آمدی

ہاں دلم برہم شکن، اما نہ آساں ایں چنیں
اے کہ قلبِ مستمنداں را شکستن آمدی

اے دلِ گریہ طلب آزارِ چشمم تا کجا
تو کہ مژگاں را بہ خونِ ناب بستن آمدی

کاوشِ بے صرفہ ام تا چند با دل اے بہار
اے کہ تو گل را ط از چاک دامن آمدی

من کہ بندم صد تمنا یم بہ ہر فردائے تو
تو کہ ہر فردا ز عہدِ خود گسستن آمدی

اختر ازت شد فزوں چندانکہ شد نشوِ شباب
تیرہ بختی آمدم چندانکہ روشن آمدی

از چہ رنجی اے نیاز از بے نیازیہائے دوست
تو نیاز ستی و ایں جا بس شکستن آمدی
نیاز

جنگل کی شاہزادی

(از حضرت جوش ملیح آبادی)

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں
اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

کچھ تازہ شعر پڑھتا مسرور جا رہا تھا
اجمیر کی طرف سے جیپور جا رہا تھا

طوفان چہچہوں کا، چڑیوں کا تھا بسیرا
گنجان جھاڑیوں کے سایہ میں تھا اندھیرا

تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی
لیلےٰ ستار اپنا گویا بجا رہی تھی

کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں
تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں

خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں

مستی شراب کی سی آنکھوں میں چھا رہی تھی
ہر سانس اک چھلکتا ساغر پلا رہی تھی

لہروں میں کوئی جیسے دل کو ڈبو رہا تھا
"میں سو رہا ہوں" ایسا محسوس ہو رہا تھا

موسیقیت سے دل کو معمور کر رہے تھے
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مخمور کر رہے تھے

تھیں آخری کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھیری

(۲)

کانٹوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے
دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے

کافر ادا، ستمگر، ساحر، دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رخ، گلرنگ، حشر ساماں

خوش چشم، خوبصورت، خوش رنگ، ماہ پیکر
نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسونگر

غارت گر تحمل، خونریز، دشمن جاں
پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں

پرتو ہے بجلیوں کا آئینہ گلی میں
یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں

صورت میں عارضوں کی، یا گل بدل گئے ہیں
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اعضا میں ڈھل گئے ہیں

حوریں ہزار دل سے قربان ہو گئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر "انسان" ہو گئی ہیں

ہر چیز پہ نگاہیں حیرت سے ڈالتی ہے
جھونکے جو چھیڑتے ہیں، چادر سنبھالتی ہے

لفظِ "غرور" دل پر مرقوم ہی نہیں ہے
"میں کون ہوں" یہ اس کو معلوم ہی نہیں ہے

خوں ریزیوں سے اپنی واقف مگر نہیں ہے
کس پر چھری چلا دی مطلق خبر نہیں ہے

ناآشنائے راہ و رسمِ فسونگری ہے
در پردہ اس کی فطرت سرگرمِ دلبری ہے

(۳)

کچھ دیر تک تو میں نے اس کو بغور دیکھا
گم تھے حواسِ خمسہ، ہر مو تھا چشمِ بینا

گاڑی سے پھر اتر کر اس کے قریب آیا
جذباتِ دل کی رو میں پھر یہ زباں سے نکلا

"اے تو کہ تیری نازک ہستی میں کام آئی
فطرت کی انتہائی تخئیلِ دلربائی"

"اے درسِ آدمیت، اے شاعری کی جنت!
اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت"

"جلووں سے تیرے روشن صحرا و دشت و وادی،
عفت کی پاک دیوی، جنگل کی شاہزادی"

"گیسو پہ تیرے صدقے زلفیں سیہ گھٹا کی
گاتی ہیں گیت تیرے، رنگینیاں فضا کی"

"بستی میں تو جو آئے، اک حشر سا بپا ہو
آبادیوں میں ہلچل، شہروں میں غلغلا ہو"

"میکش جو تجھ کو دیکھے، تھرا کے جام چھوٹے
تسبیحِ شیخ الجھے، زاہد کا زہد ٹوٹے"

"افلاک سے فرشتے لیکر خراج اتریں
زہاد کے عمامے، شاہوں کے تاج اتریں"

"آنسو ہوں خوں بداماں، نالے شرر فشاں ہوں
کیا کیا نہ شاعروں کے ملبوس دھجیاں ہوں"

"چہروں کو اہلِ دل کے بے آب و رنگ کر دے
دنیا کو حسن تیرا، میدانِ جنگ کر دے"

"تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا!
اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا"

"شام و سحر کے جلوے مجھ سے قریب ہوتے
یہ چاند اور ستارے میرے رقیب ہوتے"

"کیوں، یہ میری گفتگو سے حیرت کا جوش کیوں ہے
اے زمزموں کے چشمے اتنا خموش کیوں ہے؟"

"بجنے لگیں وفا کی محفل میں شادیانے
کچھ بول بھی زباں سے، اے سرمدی ترانے!"

"یوں چپ ہے، جیسے کوئی اب کام ہی نہیں ہے
یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے"

(۴)

یہ سن کے وہ پری وش اس طرح مسکرائی
سینہ میں روح میری گھبرا کے تھرتھرائی

دل کو شکست دینے سامانِ جنگ آیا
چہرہ پہ خون دوڑا آنکھوں میں رنگ آیا

شرما کے آنکھ اُٹھائی زلفوں پہ ہاتھ پھیرا — اتنے میں رفتہ رفتہ بڑھنے لگا اندھیرا
کچھ جسم کو سمیٹا، کچھ سانس کو سنبھالا — کاندھے پہ سُرخ آنچل انگڑائی لیکے ڈالا
ہر شے سے پھوٹ نکلے جذباتِ عاشقانہ — اور ہوگئی وہ کافر مُنہ پھیر کر روانہ

(۵)

آنکھوں سے اشک ٹپکے، سینہ سے آہ نکلی — گردوں پہ رات، لیکر فانوسِ ماہ نکلی
آواز ہر طرف سے آئی کراہنے کی — اے جوشؔ، یہ سزا ہی اچھوں کو چاہنے کی
کیا جانے دل نے کبتک غفلت کا راگ گایا — المختصر غشی سے جب مجھ کو ہوش آیا

مُڑ کر جو میں نے دیکھا امید مر چکی تھی
پٹڑی چمک رہی تھی، گاڑی گذر چکی تھی

ایک نکتۂ علم النفس

جرمنی کا مشہور وزیر بسمارک، ایک روز اپنے کسی دوست کے ساتھ شکار کو گیا۔ اتفاقاً اُس دوست کا پانوں پھسل گیا اور وہ دلدل میں جا پڑا، جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ آخر مجبور ہو کر، اس نے اپنے دوست بسمارک کو آواز دی اور دوستی کا واسطہ دلاکر کہا کہ:۔ "مجھے اس مصیبت سے کسی طرح نکالو، ورنہ میں مر جاؤنگا۔"

ہر چند صورتِ حال نہایت خطرناک تھی، لیکن بسمارک نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ "میں تمہارے لئے اپنی زندگی کو قربان نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر میں تم سے قریب ہوا، تو وہی مصیبت میرے لئے بھی ہے، جس میں تم گرفتار ہو اور چونکہ اب تمہاری موت یقینی ہے، اس لئے میرے امکان میں صرف یہی ہے کہ تمہیں تکلیف کی موت سے نجات دوں اور کچھ ایسی تدبیر کروں کہ تمہاری جان بجائے آہستہ آہستہ نکلنے کے دفعتہً پرواز کر جائے"، یہ کہکر اس نے اپنے دوست کی طرف بندوق سیدھی کی اور کہا کہ "حرکت نہ کرو تاکہ گولی ٹھیک تمہارے سر میں لگے۔"

بسمارک کی طرف سے یہ غیر متوقع طرزِ عمل دیکھ کر وہ شخص دلدل کی مصیبت تو بھول گیا اور گولی سے بچنے کیلئے اپنی تمام کوششیں صرف کرنے لگا اور آخر کار دلدل سے باہر نکل آیا۔ بسمارک کا مقصود یہی تھا کہ وہ موت کی بالکل یقینی صورت پیش نظر پاکر اپنی تمام کوشش جان بچانے میں صرف کردے، چنانچہ اس میں اُسے کامیابی ہوئی۔

نیاز

ٹیگور

(از مولوی حامد حسن قادری اڈیٹر اخبار سعید کانپور)

ٹیگور کا خاندان ڈاکٹر سر رابندرا ناتھ ٹیگور ۱۸۶۱ء میں کلکتہ میں پیدا ہوئے - ان کے والد مہارشی دیوندرا ناتھ ٹیگور عجیب صفات کے آدمی تھے - عبادت ، ریاضت ، زہد ، مشاہدہ فطرت ، حب وطن ، خدمت ملک و قوم انکے ممتاز خصائل تھے اور یہی ہمارے وحید السن شاعر رابندرا ناتھ ٹیگور میں نہایت وسعت اثر کے ساتھ نمایاں ہیں - ٹیگور کا خاندان بنگال کا مشہور و معزز گھرانہ ہے اور " ایں خانہ تمام آفتاب است " کا صحیح مصداق -

مہارشی کے بڑے بیٹے ، دوجیندرا ناتھ ٹیگور بہت بڑے فلاسفر ہیں - دوسرے بیٹے ، پہلے ہندوستانی ہیں جو انڈین سول سروس میں داخل ہوئے - ایک بیٹی ایک رسالہ (بھارتی) کی اڈیٹر ہیں - اس خاندان کے دو اور ممبر گاگندرا ناتھ ٹیگور اور اباندرا ناتھ مشہور آرٹسٹ (مصور) ہیں -

ٹیگور ، والدہ کی آغوش محبت سے بچپن ہی میں محروم ہو گئے تھے اس لئے اُن کے پیش نظر صرف والد ہی کی زندگی رہی اور ان کی طبیعت اسی سانچے میں ڈھلتی رہی - ان کے والد دیوندرا ناتھ ٹیگور نے اپنے سوانح حیات خود لکھے ہیں ، جن کا ترجمہ انگریزی زبان میں بھی شائع ہو گیا ہے -

ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ " مہارشی " کا پر عظمت خطاب اُن کے لئے کس قدر موزوں تھا - وہ اپنی سوانح عمری میں اپنے سب سے پہلے مشاہدہ روحانی کے متعلق لکھتے ہیں کہ :-

" میں گویا وہ انسان ہی نہ رہا جو پہلے تھا - دولت کی طرف سے سخت تنفر میرے دل میں پیدا ہو گیا - بانس کی چٹائی جس پر میں بیٹھتا تھا ، وہ ہی میرے لئے موزوں معلوم ہونے لگی ، قیمتی دریاں اور قالین میری نظر سے گذر گئے ، میرے دل میں ایسی مسرت موج زن ہو گئی ، جس کا احساس اس سے قبل نہ ہوا تھا ، اس وقت میری عمر اٹھارہ سال کی تھی "-

ایک اور واقعہ سے مہارشی کے حبِ قومی اور خدمت مذہبی کا اندازہ ہو سکتا ہے ، جس زمانہ میں بنگال کی چند معزز ہندو خواتین ، مشنریوں کے زیر اثر رہ کر عیسائی ہو گئی تھیں ، اس وقت مہارشی کا یہ حال تھا کہ جذبۂ مذہب سے بیقرار ہو کر روزانہ صبح سے شام تک ، کلکتہ کے معزز و ممتاز لوگوں کے پاس جاتے اور اُن سے

درخواست کرنے کہ ایسی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں کہ ہندوؤں کے بچے مشنری اسکولوں میں تعلیم نہ پائیں، بلکہ اپنے قومی اسکول قایم کئے جائیں، چنانچہ تحفظ مذہب کی غرض سے انہوں نے برہمو سماج کی بنیاد رکھی۔ اور حد درجہ محویت، استقلال اور جانفشانی سے اسکو ترقی دینے کی کوششیں کیں۔

مہارشی کا رجحان طبیعت صرف مراقبہ، مجاہدہ، اور مطالعۂ قدرت کی طرف تھا اور تمام تمام دن ایک جگہ مراقبہ میں بیٹھے گذر جاتا تھا۔ ایک مرتبہ دریا کے کنارے وہ اسی حال میں مصروف ہوگئے۔ ملاح اور سیاحان کشتی ان کی اس حالت سے ایسے متاثر ہوئے کہ کشتیاں آگے بڑھا کر اُن کی محویت میں مخل ہونے کی جرأت نہ کر سکے۔ اور جب کامل آٹھ گھنٹے کے بعد مہارشی نے سر اُٹھایا۔ تو کشتیوں کا راستہ کھلا۔

ٹیگور بھی یہی دل و دماغ اور یہی عادات و خصائل لے کر پیدا ہوئے۔ اور اُن تاثرات و جذبات نے اُن کی تمام زندگی علی الخصوص حیاتِ شعری کو نمایاں طور سے متاثر کیا۔ ٹیگور اپنے بچپن کے حالات خود بیان کرتے ہیں کہ "میں نے اپنے والد کو بہت کم دیکھا ہے اور ملازمتِ صحبت کم نصیب ہوئی ہے، لیکن اُنکی شخصیت تمام گھر پر ایک خاص اثر رکھتی تھی۔ جب وہ گھر میں آتے تھے تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی تھی اور رعب طاری ہو جاتا تھا۔ اور کسی کو یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ اُن کے مشاغلِ روحانی میں خلل انداز ہو سکے۔ میں تمام زندگی میں اُن کی شخصیت کا گہرا اثر محسوس کرتا رہا ہوں، میں بچپن میں تمام دن خدمتگاروں کی حفاظت میں قیدی بنا رہتا تھا عام بچوں کی طرح ادھر اُدھر پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ میں روزانہ کھڑکی کے سامنے بیٹھتا اور بیرونی دنیا کے حالات و مناظر کا تصور کرتا رہتا مجھے یاد ہے کہ بچپن ہی سے میں مطالعہ قدرت کا عاشق تھا۔ جب میں آسمان پر بادلوں کو ایک ایک کر کے آتے دیکھتا تو فرطِ مسرت سے از خود رفتگی کی کیفیت پیدا ہو جاتی، اس ابتدائی عمر میں بھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ایک نہایت گہرا اور بے تکلف دوست مجھے محصور کئے ہوئے ہے۔ اگرچہ اس وقت مجھے اتنا شعور نہ تھا کہ اس کا کوئی نام و نشان بتا سکتا، مجھے نیچر سے اتنی محبت تھی کہ الفاظ میں اُنکا اظہار ممکن نہیں۔ نیچر ایک قسم کی رفیق تھی جو ہر وقت میرے ساتھ رہتی تھی اور ہمیشہ نیا حسن میرے سامنے پیش کرتی رہتی تھی۔"

تعلیم و سفرِ انگلستان | رابندرناتھ ٹیگور، اسکول میں داخل کئے گئے، لیکن اسکول سے ہمیشہ اُن کو نفرت رہی۔ مدارس مروجہ کے طرزِ تعلیم سے اُن کی طبیعت فطرتاً بیگانہ و بیزار تھی۔ اسکولوں میں نصاب معین کے علاوہ نہ مطالعۂ قدرت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے نہ انتخاب مضامین کا خاص لحاظ ہوتا ہے۔ دراصل یہ ٹیگور کی

نظریں صحیفہ فطرت کے سوا اور کچھ نہ دیکھنا چاہتی تھیں۔ اسکولوں میں انتظام رعب واثر پیدا کر کے قایم رکھا جاتا ہے اور ٹیگور آزاد رہنا چاہتے تھے اور اس انتظام کے قائل تھے جو تربیت و اخلاق کا بلاواسطہ نتیجہ ہو۔ غرض اسکول کی تعلیم کا زمانہ ٹیگور کے لئے نہایت ناخوشگوار رہا۔ وہ اسکول جانے سے بچنے کے لئے اپنے جوتوں کو پانی میں بھگو لیتے تھے اور بیمار ہو جاتے تھے۔ ایک اسکول ماسٹر کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ اُن کے ساتھ نہایت بے رحمی کا برتاؤ کرتا تھا اور گھنٹوں دھوپ میں ننگے سر کھڑا رکھتا تھا۔ جب اُن کے والد کو یہ حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے اسکول سے علیحدہ کر لیا اور ان کی تعلیم پرائیویٹ اُستادوں کے سپرد کر دی۔ چنانچہ ٹیگور نے ان اُستادوں اور اپنے بھائی سے تعلیم حاصل کی اور اتنی جلد ترقی کی کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ شاعری موسیقی اور ڈراما میں ایکٹ کرنے سے اُن کو طبعی مناسبت تھی۔ اسی سبب سے ان فنون کے تمام شعبوں میں بہت جلد مہارت پیدا کر لی۔

سترہ سال کی عمر میں انگلینڈ گئے اور یونیورسٹی کالج میں داخل ہوئے۔ وہاں مسٹر جان مارلے (جو بعد میں لارڈ اور وزیر ہند ہوئے) کی نگرانی میں انگریزی لٹریچر حاصل کیا۔ ایک سال کے بعد ہندوستان واپس آئے اور پھر دوبارہ انگلینڈ گئے۔

آغاز شاعری و تصانیف ٹیگور نے ابتدائی نظمیں پہلی مرتبہ انگلستان سے واپس آکر لکھی ہیں، اسی زمانہ میں مضامین، فسانے اور ڈرامے بھی لکھنے شروع کر دیئے تھے، ۲۳ سال کی عمر میں ان کی شادی ہوئی، اس کے بعد والد نے ان کو اپنی جاگیر شلیدا کے انتظام کے لئے بھیجا۔ گانوں کی زندگی اور جائداد کے بندوبست سے ان کی طبیعت کو مطلق مناسبت نہ تھی۔ اسی وجہ سے یہ خدمت بہت گراں گذری۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ٹیگور کی شاعری میں جذبات، تاثرات، اور حسیات کا گہرا رنگ اسی دیہاتی زندگی کی برکت ہے۔ یہیں ان کو کسانوں کی سادہ معاشرت اور حقیقی جذبات کا علم حاصل ہوا اور اس زمانہ کے بعد سے ان کی شاعری اور فسانوں نے نیا رنگ اختیار کر لیا۔ شلیدا میں سترہ سال رہے۔ اور بہت سی اعلیٰ نظمیں اور عمدہ تصانیف یہیں رہ کر لکھی ہیں۔

بچپن میں ٹیگور کے والد، ان کو اپنے ساتھ ہمالیہ کے سفر میں لے گئے تھے۔ اس سفر میں قدرتی مناظر دیکھنے کا موقع ملا۔ اور ٹیگور کو نہایت فرحت و مسرت حاصل ہوئی۔ مطالعہ قدرت کا ذوق سلیم تو طبیعت میں موجود ہی تھا، اب مشہور شعرا ودیا پتی، جے دیو، چانڈی داس اور کبیر کی نظموں کا مطالعہ کیا تو اُن کے خیالات نے ٹیگور پر خاص اثر ڈالا۔ چنانچہ ٹیگور کی شاعری میں سری چیتنیا جیسے مصلح قوم کی تعلیمات و روحانیت کے ساتھ

چانڈی داس اور جے دیو کا تخیل اور زورِ بیان بھی موجود ہے،

بولپور اسکول کا افتتاح اب ٹیگور کو خدمتِ وطن کا خیال پیدا ہوا، اگرچہ ٹیگور نے اپنی نظم و نثر کے ذریعے ملک و زبان کی جو خدمت کرنی شروع کی تھی وہ کچھ کم نہ تھی، لیکن ٹیگور کا دردمند دل اور ہمہ گیر طبیعت صرف فلسفہ و شعر پر قناعت نہیں کر سکتی تھی - انہوں نے دنیائے عمل اور میدانِ تعاون میں قدم رکھنا چاہا۔ ہندوستان کے اسکولوں اور طرزِ تعلیم کا ان کو ذاتی طور پر تلخ تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے جدید اصول پر اپنا اسکول جاری کرنے کا ارادہ کیا اور بولپور میں ایک مدرسہ قایم کر دیا۔ جس کا نام "شانتی نکیتن" (امن منزل) رکھا اور ۱۹۰۱ء میں یہ اسکول صرف دو یا تین طالب علموں کی تعداد کے ساتھ کھولا گیا اور دو سال میں یہ تعداد ۴۰ ہو گئی، چار سال میں ۶۰ تک پہونچی، لیکن اب کئی سو طالب علم تعلیم پاتے ہیں اسکول کے مصارف پورا کرنے کے لئے ٹیگور نے بڑی پریشانیاں اٹھائیں اور اسکول کی خاطر اپنی کتابیں اور حقوقِ تصنیف فروخت کرنے پڑے۔

صدمات و حوادث جس زمانہ میں "شانتی نکیتن" قایم ہوا اور ٹیگور کو اُس کے قایم رکھنے میں دشواریاں پیش آئیں، اسی زمانے میں ان کو کئی صدمے برداشت کرنے پڑے - اول اُن کی بیوی کا انتقال ہوا چند مہینے کے بعد اُن کی لڑکی دق و سل کے مرض میں مری - اس کے بعد اُن کا چھوٹا لڑکا ہیضہ میں فوت ہوا معمولی انسان کے لئے یہ متواتر صدمے کس قدر ناقابلِ برداشت اور دلشکن ہوتے ہیں، لیکن ٹیگور کہتے ہیں کہ ان صدموں نے میری طبیعت میں ایک انقلاب روحانی پیدا کر دیا اور میرے دل میں رضا و تسلیم کی قوت بڑھا دی۔ حقیقی فلاسفر اور فطری شاعری۔ محض محبِ ملک اور صادق خادمِ قوم کے یہی معنی ہیں یہ حوادث اس کے تخیل کو زیادہ بلند اور اس کی روح کو بالکل آزاد کر دیتے ہیں۔

تیسرا سفر اسی زمانہ میں گیتان جلی لکھی گئی۔ اس کے بعد ٹیگور نے پھر انگلستان کا سفر کیا، اس مرتبہ اپنی صحت کے لئے بھی جانے کی ضرورت تھی اور مقصد یہی تھا کہ اپنے لڑکی کی تعلیم کے زمانہ میں اس کے ساتھ ولایت میں رہیں۔

انگلستان پہونچکر ٹیگور نے اپنی چند نہایت اعلیٰ نظموں کا ترجمہ (جن میں "گیتان جلی" (نذرِ نغمہ) "دی گارڈنر" (باغبان)، "دی کریسنٹ مون" (الہلال) بہت مشہور ہیں) انگریزی میں کیا۔

نوبل پرائز ان ہی نظموں پر ۱۹۱۳ء میں ٹیگور کو یورپ کا سب سے بڑا علمی انعام "نوبل پرائز" ملا یہ انعام، لٹریچر کی ممتاز ترین تصنیف پر دیا جاتا ہے - سویڈن کے ایک مشہور و فاضل مستشرق نے گیتان جلی

کے انگریزی ترجمے کی اشاعت سے قبل ٹیگور کی نظمیں بنگالی زبان میں پڑھی تھیں، اسی کی سفارش سے یہ انعام دیا گیا۔ یورپ کے تمام مستند مستشرقین، فاضلانِ ادب اور مشہور اہلِ قلم نے اس انعام پر "حق بحق دار رسید" کا فتویٰ صادر کیا۔ اور دنیائے ادب میں دھوم مچ گئی۔

ٹیگور نے اس انعام کی آٹھ ہزار پونڈ (ایک لاکھ بیس ہزار روپیہ) کی رقم سب کی سب بولپور اسکول کے لئے وقف کر دی۔

ٹیگور کی قابلیت کا اعتراف یہ بات کچھ کم دلچسپ اور عجیب نہیں کہ ٹیگور نے کسی یونیورسٹی میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ اور نہ کوئی ڈگری حاصل کی۔ تاہم ان کی انگریزی زبان کی مہارت کا یہ عالم ہے کہ بڑے بڑے فاضل زباندان اُن کی تحریر کو پڑھ کر محو حیرت ہو جاتے ہیں۔ اور بالاتفاق اعتراف کرتے ہیں کہ ٹیگور نے اظہار جذبات اور ادائے خیالات کے لئے انگریزی زبان میں نہایت لطیف، بے حد اور پُر اثر اور بالکل جدید اسلوب ادا اختیار کیا ہے۔ ٹیگور کا بیان ہے کہ "نظموں کو انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت مجھے اُن کا قیمتی زیور اور خوشنما لباس اُتار کر بالکل سادہ لباس پہنانا پڑا"، لیکن ایک فاضل مستشرق مسٹر اینڈریوز کہتے ہیں کہ "اس بالکل سادہ لباس میں ایسی خوبصورت اور شاعرانہ نثر نظر آتی ہے جس نے انگریزی لٹریچر کو بیش قیمت لعل و جواہر بخشے ہیں اور اس کے حدود کو وسیع کر دیا ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر ادب نے علانیہ تسلیم کر لیا ہے کہ گیتان جلی کی اشاعت سے انگریزی لٹریچر کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔"

انگلستان میں ٹیگور کو ایک ایڈریس پیش کیا گیا تھا۔ اس کا ایک فقرہ یہ ہے:۔

"آپ نے اپنی خداداد ذہنی قابلیت کو پاک ترین مقاصد کے لئے وقف کر دیا ہے آپ نے دل کے لئے مسرت پیش کی ہے، دماغ کے لئے راحت وسکون، کانوں کے لئے موسیقی، آنکھوں کے لئے تصاویر حسن اور روح کو یہ بات یاد دلائی ہے کہ اس کا منبع ذات الٰہی ہے۔"

ہندوستان کے ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کا ایک مشترکہ وفد "شانتی نکیتن" میں ٹیگور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بابو ہرندر ناتھ دت نے بنگالی میں مختصر ایڈریس پڑھا جس میں ٹیگور کو "سلطنت تخیل و علم کا شہنشاہ" قرار دیا اور اہل بنگال کی طرف سے تہنیت پیش کی۔ ریورنڈ مسٹر ملبرن نے انگریزی میں تقریر کی اور ہندوستان کی عیسوی اور یوروپین جماعت کی طرف سے محبت و احترام کا اظہار کیا اور کہا کہ "گیتان جلی" کے چند حصے بشپ کالج کے عیسائی طلبہ کی روزانہ دعا میں شامل کر لئے گئے ہیں"، مسلمانوں کی طرف سے

مولوی ابوالقاسم نے ہدیۂ تحسین پیش کیا۔

لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند نے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ٹیگور کو "ملک الشعرائے ایشیا" قرار دیا۔

دسمبر ۱۹۱۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی گورنمنٹ نے "سر" کا معزز خطاب دیا۔

یورپ، امریکہ، جاپان، جہاں جہاں ٹیگور گئے، ان کے اعزاز میں ہر جگہ بڑے عظیم الشان جلسے ہوئے جن میں ہزارہا حاضرین نے خاص ذوق و محویت کے ساتھ ٹیگور کے لکچر سُنے۔

قبولیت عام | یہ تو اُن خراجہائے تحسین کا مختصر ذکر تھا جو مہذب و متمدن دنیا کے فاضلوں، شاعروں اور ادیبوں نے شوق و محبت کے ہاتھوں سے ٹیگور کو نذر کیے، اس کے ساتھ ہی ذیل کے دو دلچسپ واقعات بھی قابل ذکر ہیں۔ جن سے اس اثر اور قبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو ہندوستان کے بعض جاہل اور وحشی طبیعتوں کے دلوں پر حکمراں ہے۔

مسٹر ارنیسٹ رائس اپنی کتاب "حیات ٹیگور" میں لکھتے ہیں کہ ایک موقع پر لندن میں مسٹر مانٹیگو، نائب وزیر ہند نے بیان کیا کہ وہ ایک مرتبہ ہندوستان کے کسی جنگل میں رات کے وقت گھوڑے پر سوار گذر رہے تھے۔ ایک مقام پر دیکھا کہ دو تین آدمی آگ کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ مسٹر مانٹیگو راستہ دریافت کرنے اور اپنے تھکے ہوئے گھوڑے کو آرام پہونچانے کے خیال سے اُتر پڑے اور اُن لوگوں کے پاس آئے۔ تھوڑی دیر میں ایک غریب اور خستہ حال لڑکا جنگل سے نکل کر آیا اور آگ کے پاس بیٹھ گیا۔ اول ایک آدمی نے کچھ گانا شروع کیا، پھر دوسرے نے گایا، اس کے بعد لڑکے کی باری آئی، اور اس نے ایک گیت گایا جو الفاظ اور موسیقی کے اعتبار سے پہلے گیتوں سے زیادہ دلکش تھا۔ لڑکے سے پوچھا کہ یہ گیت کس کا ہے تو اُس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں لوگ ہر جگہ ان گیتوں کو گاتے ہیں۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد مسٹر مانٹیگو نے وہی گیت کسی دوسرے اور وہاں سے بعید مقام پر لوگوں کو گاتے سُنا۔ پوچھا کہ یہ گیت کس نے بنایا ہے تو لوگوں نے رابندرا ناتھ ٹیگور کا نام لیا۔ مسٹر مانٹیگو نے اس سے قبل ٹیگور کا نام بھی نہ سُنا تھا۔

دوسرا واقعہ ریورنڈ سی الیف اینڈرز کا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں وسط ہمالیہ کے ایک گانوں میں مقیم تھا جو شاعر (ٹیگور) کے وطن سے اتنی دور ہے جتنا لندن سے قسطنطنیہ۔ شام کے وقت لوگ گیت گا رہے تھے۔ ایک چھوٹے سے لڑکے نے جس کی عمر بارہ برس کی ہوگی ٹیگور کی ایک نظم گائی، جس کا مضمون مادر وطن تھا، نظم کی زبان پہاڑیوں کے لئے مشکل تھی، لیکن الفاظ کی روانی اور چھوٹے سے گانیوالے کا جذبۂ خفی، خود

معنی خیز اور پُراثر تھا۔ سُننے والے اس طرح جھوم رہے تھے کہ گویا کوئی جادوگر اپنے جادو سے ان کو مست و بے خود کر رہا ہے، ہندوستان میں ٹیگور کی موسیقی اور شاعری کے اثر و قوت کا یہ عالم ہے" سچ ہے

"قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است"

ٹیگور کی شکل و شمائل | ٹیگور نہایت ذی وجاہت اور شاندار آدمی ہیں۔ لمبا قد، سفید رنگ، بڑی بڑی روشن اور سیاہ آنکھیں جن سے متانت و سکون قلب جھلکتا ہے۔ پتلی ناک، نرم و حساس ہاتھ، کشادہ پیشانی، بڑے اور گھنے بال، لمبی ڈاڑھی، جس میں سیاہی کے ساتھ سفیدی بھی نمایاں ہو چلی ہے۔ قیافہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاعر، فلسفی شاعر اور قدرتی شاعر ہیں۔ جوانی میں بہت خوبصورت تھے۔ اپنے بچپن کا خود ذکر کرتے ہیں کہ "میں بہت حسین و محبوب تھا میرے بچپن کی یہ خاص شان تھی۔ میں لوگوں کی نظروں میں بہت ہی محبوب تھا" شباب کے بعد بھی ٹیگور ایک مصور کے موقلم کا موضوع نقاشی قرار پائے۔

بنگال میں لمبی ڈاڑھی، اور لمبے بال کا فیشن۔ ٹیگور ہی کی ایجاد ہے۔ اہل بنگال، ٹیگور کو اس درجہ عزت و محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ بات بات میں ان کی تقلید کرنا چاہتے ہیں۔ ایک دن شام کو ٹیگور کسی جلسے میں لکچر دینے کے لئے گئے، اس وقت تمام لباس سفید پہنے ہوئے تھے، کوٹ بھی سفید تھا، دھوتی بھی، چادر بھی، جوتہ بھی، موزے بھی، اور جس کپڑے میں ان کی تقریر لپٹی ہوئی تھی وہ بھی سفید تھا۔ یہ وضع اتنی پسند کی گئی کہ اگلے دن سے تعلیم یافتہ بنگالیوں میں سفید کپڑے پہننے کا فیشن ہو گیا۔

اُن کی آواز شیریں، اور اندازِ گفتگو نہایت دلکش ہے۔ ان کی ملاقات سے دل پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ گویا وہ عالم بھی ہیں اور صوفی بھی، شاعر بھی ہیں اور فلاسفر بھی۔ اُن کا شغفِ مذہبی مشہور ہے۔ ذاتی و خاندانی مصائب ان کو شکستہ دل نہیں کرتے بلکہ عالمگیر محبت و ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنی بیماری کو نہایت صبر و سکون سے برداشت کر لیتے ہیں۔ خطوط کا جواب باقاعدہ اور اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں، متحمل و ہمدرد ہیں۔ اپنی جاگیر کا انتظام مختاروں اور نائبوں کو سپرد کر رکھا ہے، لیکن نگرانی خود کرتے ہیں اور بدعنوانی یا کاشتکاروں کے ساتھ بدسلوکی کے جرم میں منتظموں کو برخاست کر دیتے ہیں، اس کے ساتھ ہی یہ رحم بھی ہے کہ کاشتکار لگان ادا نہیں کر سکتے، تو نہایت فراخ دلی کے ساتھ معاف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ۱۳۱۲ف میں انہوں نے ستاون ہزار پانچسو بچانوے روپئے معاف کر دیئے۔ ان کے علاقے میں کئی ابتدائی اسکول، ایک انگریزی اسکول اور ایک خیراتی شفاخانہ ہے ان کے علاوہ ایک زراعتی بینک بھی ہے۔ نوگانوں کے افسر بندوبست کی رائے ہے کہ

"ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے علاقہ میں انتظام ریاست کی نہایت عمدہ مثال موجود ہے"

ٹیگور کو تنہائی و خاموشی بہت پسند ہے، گھنٹوں یادِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں، پیرنے اور کشتی چلانے کا بھی شوق ہے۔ لیکن گانے کا ذوق سب سے بڑھا ہوا ہے۔ ہر چند وہ بہت اچھا گا نہیں سکتے۔ لیکن فن موسیقی میں اُن کی مہارت بڑے بڑے ماہرانِ فن کو بھی تسلیم ہے۔ بعض مرتبہ صبح سے رات تک مسلسل گاتے اور گنگناتے رہتے ہیں۔ صرف دوپہر کا کھانا کھانے کیلئے ایک دو گھنٹہ کا وقفہ ہو جاتا ہے۔

نظم تصنیف کرتے وقت گنگنانے لگتے ہیں اسی طرح سے اول دل ہی دل میں موزوں کر لیتے ہیں پھر لکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ لکھکر بہت کم ترمیم کرتے ہیں۔

ٹیگور کو سب سے زیادہ نیچر سے عشق ہے۔ قدرتی مناظر کو دیکھکر بے خود ہو جاتے ہیں۔ ابتدا سے نیچر ہی کو انہوں نے مادرِ شفیق سمجھا اور اسی کی آغوشِ محبت میں روحانی تربیت اور ذہنی پرورش پائی۔ سب سے پہلے اوائلِ عمر میں اپنے والد کے ہمراہ سفرِ ہمالیہ میں حُسنِ قدرت سے متاثر و مسحور ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے یہ جادو برابر اثر کرتا رہا اور اب مناظرِ قدرت سے از خود رفتگی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہے۔ کسی دوست کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میں اس مکان کی دوسری منزل پر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا لکھ رہا ہوں پتوں کا موجزن ہرا سمندر کھلے ہوئے دروازوں سے چاروں طرف نظر آرہا ہے جو موسم سرما کی نسیم سحر کے لمس سے متحرک ہے اور نورِ آفتاب سے درخشاں۔"

شانتی نکیتن | بول پور کا اسکول "شانتی نکیتن" یا "پیس کاٹیج" (امن منزل) حقیقت میں ہندوستانی درس گاہوں اور اقامت کدوں کے لئے قابلِ تقلید نمونہ ہے اس کے مقاصد اور طریقۂ تعلیم و تربیت خود ٹیگور کی زبان سے سننے چاہئیں۔ وہ مسٹر فریڈرک بوس کے استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"بولپور میں اسکول قائم کرنے سے میرا خاص مقصد لڑکوں کو روحانی تربیت دینا تھا خوش قسمتی سے ہندوستان میں ہمارے سامنے قدیم صحرائی مدارس کا نمونہ موجود ہے۔ اسکول کے اس نمونہ کو ذہن میں رکھکر جو گھر اور عبادت گاہ دونوں کی حیثیتوں کا جامع ہو، جہاں تعلیم پرستارانہ زندگی کا جزو ہو۔ میں نے یہ مقام پسند کیا جو شہر کی تمام شورشوں سے دور ہے۔ جو ایک مقدس زندگی کی یاد کی برکت سے معمور ہے، جس کے دن یہاں یادِ الٰہی میں بسر ہوئے ہیں۔ اس راستے میں پہلی مدد جو ہمارے لڑکوں کو یہاں دی جاتی ہے وہ ان کے دل میں نیچر کی محبت اور تمام ذی حیات

مخلوق کے ساتھ ہمدردی پیدا کرتا ہے۔ موسیقی اُن کے لئے بہت بڑی مدد ثابت ہوگی، گیت معمولی کلام موزوں خشک اور معلمانہ نہیں ہوتے بلکہ جہاں تک گیتوں کے مصنف کی قدرت میں ہے مسرت شعری سے لبریز ہوتے ہیں۔ آپ اندازہ کرسکیں گے کہ یہ گیت لڑکوں پر کیا اثر کرتے ہیں، جب یہ سنیں گے کہ ان گیتوں کو گاتے رہنا بہترین مشغلہ تفریح و مسرت ہے جو لڑکے اپنے اوقات فرصت میں چاندنی رات میں، اور ایام بارش میں جب اسکول بند کر دیا جاتا ہے اپنے لئے انتخاب کرتے ہیں، صبح شام لڑکوں کو پندرہ منٹ اس کام کے لئے دیئے جاتے ہیں کہ وہ کھلے میدان میں بیٹھ جائیں اور عبادت کے لئے اپنے دل و دماغ کو یکسو کریں ہم ان اوقات میں ان کی نگرانی نہیں کرتے نہ اُن سے سوالات کرتے ہیں کہ وہ کیا سوچتے رہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس معاملہ میں لڑکوں کو تعلیم و تلقین کرنا اس قدر قابل اعتماد و اطمینان نہیں، جتنا قدرت کا نیم محسوس اثر مقام کا ماحول اور وہ روزانہ پرستارانہ زندگی ہے جو ہم گذار رہے ہیں۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مدرسوں کا طرز تعلیم اور اقامت گاہوں کا طریقہ تربیت طالبعلموں کی سیرت (کیریکٹر) آیندہ معاشرت اور قوائے ذہنی کے لئے تعمیر کن نہیں بلکہ انہدام آور ہے۔ سرکاری مدارس سے قطع نظر کرکے ہندو مسلمانوں کے قومی درس گاہوں پر غور کیا جائے تو اُن کی حالت بھی اس اعتبار سے قابل اطمینان نہیں۔ مذہبی تعلیم تمام قومی مدارس کا جزو قرار دی جاتی ہے، لیکن اس کے لئے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ اپنے نفس کو فریب دینے سے زیادہ کچھ نہیں۔ صرف چند مذہبی کتابیں نصاب میں شامل کردینا اور اس کے لئے روزانہ تھوڑا سا وقت مقرر کردینا مدرسے کے قومی و مذہبی امتیاز کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے لیکن مطالعہ فطرت کی رغبت، مناظر قدرت کے شوق، قوائے روحانی کی تہذیب کے لئے کیا بندوبست ہے؟

"شانتی نکیتن" میں تعلیم بنگالی زبان میں دی جاتی ہے روزانہ صبح کو ساڑھے چار بجے لڑکوں کی ایک جماعت گیت گاتی ہوئی اسکول کا چکر لگاتی اور سوتے ہوئے لڑکوں کو جگاتی ہے، لڑکے اُٹھ کر اپنے کمرے اپنے ہاتھ سے صاف کرتے ہیں، اس کے بعد کھلی ہوا میں ورزش کرتے اور نہاتے ہیں اور پندرہ منٹ خدا کا دھیان کرتے ہیں پھر گھنٹی بجتی ہے اور سب لڑکے صف بندی کے ساتھ اسکول کے مندر میں جاتے ہیں۔ اس سے فارغ ہو کر ناشتہ کرتے ہیں۔ ناشتے کے بعد، ۷ بجے سے ۱۰ بجے تک تعلیم ہوتی ہے۔ ۱۲ بجے کھانا کھاتے ہیں۔ ۲ بجے سے ۵ تک پھر تعلیم ہوتی ہے۔ اس کے بعد شام کا ناشتہ کرتے ہیں اور پھر تھوڑی دیر کھیلتے ہیں کھیل کے بعد

شام کے کھانے سے قبل لڑکوں کو کہانیاں سُنائی جاتی ہیں اور موسیقی و نقالی سکھائی جاتی ہے۔ شام کو بڑے لڑکے قریب کے گانوں میں جاتے ہیں، گانوں کے لڑکوں کو تعلیم دیتے ہیں اور گانوں والوں کے بہت سے کام کر دیتے ہیں، اس طرح اُن کے دلوں میں خدمت و ایثار کا شوق پیدا کیا جاتا ہے اور دیہات کی سادہ و بے لوث زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ ساڑھے نو بجے لڑکے سو جاتے ہیں سونے سے پہلے پھر لڑکوں کی جماعت نغمہ سرائی کرتی ہوئی اسکول کا چکر لگاتی ہے۔

ٹیگور کا اصول یہ ہے کہ "لڑکے پر اعتبار کرو اور اس کو بڑھنے دو"۔ شانتی نکیتن کے اساتذہ سچی مسرت اور حقیقی ہمدردی کے ساتھ کام کرتے ہیں، کوئی ہیڈ ماسٹر مقرر نہیں کیا جاتا۔ تمام اُستاد یکساں مرتبہ و عزت رکھتے ہیں وہ ہر سال خود ہی اسٹاف میں سے کسی کو ہیڈ ماسٹر بنا لیتے ہیں طالب علموں سے بے تکلفی اور یگانگت برتی جاتی ہے۔ ہفتے میں دو بار مندر میں عبادت کی جاتی ہے جب ٹیگور وہاں موجود ہوتے ہیں تو اپنی نگرانی میں عبادت کراتے ہیں ورنہ کوئی اُستاد اُن کا قائمقام ہو جاتا ہے۔ جسمانی سزا کی سخت ممانعت ہے۔ انتظام قایم رکھنے اور سزا دینے کے لئے یہ اہتمام ہے کہ چند لڑکے کپتان بنا دیئے جاتے ہیں اور لڑکوں کی عدالت قایم کی جاتی ہے، ہر مہینے نئے انتخابات ہوتے ہیں اور لڑکے خود ہی انتظام کے قواعد اور سزا کے قوانین تجویز کر لیتے ہیں۔ لڑکوں کی اس جمہوری حکومت میں انعام دینے کا بھی دستور نہیں، تعطیلوں میں استاد اور لڑکے مختلف مقامات پر سیر و تفریح کے لئے جاتے ہیں۔

ٹیگور، طالبعلموں سے بہت محبت کرتے ہیں وہ اسکول کی روزانہ مصروفیتوں میں حصہ نہیں لیتے لیکن کبھی کبھی لٹریچر اور موسیقی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور لڑکوں سے تصویریں بنواتے اور نظمیں لکھواتے ہیں اور ان مشاغل میں ان کی بڑی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ ہر سال تعلیم کے ختم ہونے پر لڑکے ٹیگور کا کوئی ڈراما کھیلتے ہیں۔ اور ٹیگور خود بھی اس میں شریک ہوتے ہیں۔ ٹیگور اکثر لڑکوں کے سامنے لیکچر دیتے ہیں اور معمولی گفتگو میں بھی ان کو اعلےٰ مقاصد زندگی کی طرف رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ اسکول کی سال گرہ اور نئے سال کے آغاز پر جشن منائے جاتے ہیں۔ اور دنیا کے بڑے بڑے روحانی معلموں اور مصلحوں کی یادگار میں سالانہ جلسے ہوتے ہیں۔

"شانتی نکیتن" میں مذہب کے صرف وہی اصول سکھائے جاتے ہیں جو ہندوؤں کے تمام فرقوں میں مشترک ہیں۔ برہمو یا آریہ سماج کے اصول کی کبھی تعلیم نہیں دی جاتی۔ نصاب تعلیم سنسکرت، بنگالی، انگریزی، ریاضی، سائنس، تاریخ، جغرافیہ اور طبعیات پر مشتمل ہے۔

آخر میں ہم اُن ترانوں کا ترجمہ درج کرتے ہیں جو "شانتی نکیتن" میں صبح و شام لڑکے ہم آواز ہو کر گاتے ہیں

ا-

ترانۂ صبح

ا- تو ہمارا باپ ہے۔ ہم تجھے اپنا باپ سمجھنا چاہتے ہیں۔ ہم کو نزانہ دے ہم سچائی کے ساتھ تیرے سامنے جھکنا چاہتے ہیں۔

۲- اے آقا، اے باپ ہمارے گناہ دور کردے اور ہم کو وہ چیز دے جو نیک ہے

ہم اس کے سامنے جھکتے ہیں ، جس کے اندر مسرت ہے

ہم اس کے سامنے جھکتے ہیں ، جس کے اندر نیکی ہے

ہم اس کے سامنے جھکتے ہیں ، جس سے مسرت آتی ہے

ہم اس کے سامنے جھکتے ہیں ، جس سے نیکی آتی ہے

ہم اس کے سامنے جھکتے ہیں ، جو نیک ہے

ہم اس کے سامنے جھکتے ہیں ، جو سب سے بڑا نیک ہے

شانتی ! شانتی ! شانتی ہری ادم۔

ترانۂ شام

وہ خدا جو آگ کے اندر ہے جو پانی کے اندر ہے

جو تمام دنیا کے اندر دائرہ ساری ہے۔ جو گیاہ سبز

میں ہے جو درختوں میں ہے، اس خدا کے سامنے

ہم بار بار اپنا سر خم کرتے ہیں۔

صنعتی اسکول ۱۹۱۳ء میں ٹیگور نے صنعت و حرفت کی تعلیم کے لئے "آرٹ ہاوس" کے نام سے ایک مدرسہ قایم کیا اور اس کو کلکتے میں اپنے مکان کا ایک حصہ دے دیا، اس اسکول میں لڑکوں کے ساتھ لڑکیاں بھی تعلیم پاتی ہیں، جن میں بیاہی اور کنواری دونوں شامل ہیں۔ مختلف دستکاریاں سکھائی جاتی ہیں۔ ٹائپ رائٹنگ اور شارٹ ہینڈ کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ ٹیگور کے بڑے بھائی دوجندرناتھ ٹیگور نے بنگالی زبان کی مختصر نویسی ایجاد کی ہے۔ وہی اس اسکول میں رائج ہے

ٹیگور کا میلان سیاست ٹیگور شعر و فلسفہ، زہد و تصوف، تہذیب اخلاق و اصلاح معاشرت کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ اور یہی کام کرتے ہیں، لیکن حب وطن، خدمت ملک، ایثار و ہمدردی کے جذبات بھی اُن کے دل میں

پوری طاقت اور جوش کے ساتھ موجود ہیں، وہ سیاسی جد و جہد میں ہمہ تن مصروف ہیں، لیکن ہندوستانی اور بین الاقوامی سیاست کو خوب سمجھتے ہیں اور اپنے حالات اور میلان طبع کی مناسبت سے عملی حصہ لینے میں کبھی تامل نہیں کرتے۔ یورپ، امریکہ، جاپان وغیرہ ممالک میں جو لکچر دیئے ہیں اور برابر دیتے رہتے ہیں، اُن کے ذریعہ سے اپنے خاص مضامین و مسائل کے علاوہ ہندوستان کی سیاسی نیابت کا حق بھی ادا کرتے رہتے ہیں۔

۱۹۰۸ء میں وہ پراونشیل کانفرنس کے اجلاس پٹنہ میں صدر ہوئے تھے، گذشتہ مظالم پنجاب نے اُن کے دل پر نہایت دردناک اثر کیا اور انہوں نے تلافی مظالم اور امداد اہل پنجاب کے لئے وائسرائے ہند سے اپیل کی۔ موجودہ تحریک ترک موالات کے سلسلے میں ٹیگور نے اپنا سر کا خطاب واپس کر دیا ٹیگور نے سیاسی مضامین پر ایک کتاب بھی "راجا پرجا" (راعی و رعیت کے نام سے لکھی ہے)۔

ٹیگور کی تصانیف | بنگالی زبان میں ٹیگور کی اسی کے قریب تصنیفات ہیں۔ انگریزی زبان میں سات مستقل کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن کو ٹیگور نے خود بنگالی سے ترجمہ کیا ہے۔ اُن کے علاوہ پچاس سے زیادہ متفرق نظمیں اور مضامین مختلف انگریزی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

ہم انگریزی تصانیف کا مختصر سا حال محض تعارف کے طور پر درج کرتے ہیں۔ صرف "گارڈنر" (باغبان) کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کریں گے۔

گیتان جلی۔ یہی وہ کتاب ہے، جس کی بعض نظموں کے ترجمے پر ٹیگور کو "نوبل پرائز" ملا جس کے دقیق متصوفانہ مضامین، بلند خیالات، مجتہدانہ انداز بیان اور جدید اختراع الفاظ نے دنیا بھر کے فاضلوں اور زبان دانوں کو محو حیرت بنا دیا۔ اور ایک نقاد زبان نے اس کو "انگلش لٹریچر کا پھول" قرار دیا مسٹر ییٹس گیتان جلی کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "میں کئی دن تک ان تراجم کے مسودے کو اپنے ساتھ لئے پھرتا رہا ہوں۔ ریلوے ٹرین میں، گاڑیوں کی چھت پر، ہوٹلوں میں ہر وقت اور ہر جگہ پڑھتا رہا ہوں اور اکثر اس خیال سے کتاب کو بند کرنا پڑا ہے کہ کہیں اور مسافروں کو اس بات کا احساس نہ ہو جائے کہ اس تحریر نے مجھ پر کیا اثر کیا"۔ یہ نظمیں گویا ایک نذر ہیں جو دربار خداوندی میں بصورت نغمہ پیش کی گئی ہے۔ اسی لئے اس کا نام "سانگ آفرنگ" (نذر نغمہ) رکھا گیا ہے اس میں "وحدت الوجود" کی تبلیغ کی گئی ہے۔ شاعر کو ہر چیز میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اور اس کو رضا و تسلیم اور فنافی الذات ہونے کا سبق دیتا ہے۔ یہ کتاب عجیب روحانی جذبات اور وجدانی کیفیات سے لبریز ہے۔

کریسنٹ مون - (الہلال) یہ کتاب اپنے جدت موضوع اور وسعت خیالات کے اعتبار سے بالکل نئی اور نہایت عجیب ہے - طریقت و سلوک، فنافی الذات، وحدت الوجود رضا و تسلیم (جو گیتان جلی کا موضوع ہیں) پر تو ہر زبان میں سیکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں، اسلامی صوفیوں اور شاعروں نے روحانی مشاہدات، وجدانی انکشافات اور قلبی مسرات کو ایسے دلکش، پرکیف اور لبریز محبت انداز میں بیان کیا ہے کہ ٹیگور کی "نذر نغمہ" کی کوئی خاص وقعت باقی نہیں رہتی، لیکن "کریسنٹ مون" کے موضوع پر کسی زبان میں کوئی مستقل تصنیف نظر نہیں آتی - ان نظموں میں بچے کو مختلف حیثیتوں سے پیش کیا گیا ہے اور دکھایا گیا ہے کہ بچے کا اثر ہماری زندگی، ہماری معاشرت، ہمارے خیالات، ہمارے جذبات، ہماری روح پر کیا ہوتا ہے - بچہ ہر شخص کو پیارا معلوم ہوتا ہے، اس کی بھولی صورت، پیاری باتیں، معصومانہ انداز سب کو پسند ہیں - ہر زبان کی شاعری میں اس موثر و متاثر ہستی کے متعلق خیالات ظاہر کئے گئے ہیں - اور انصاف یہ ہے کہ کچھ کم دقیق و لطیف نہیں - عربی میں بچوں کے مرثیے، فارسی و اردو مثنویوں میں "ہیرو" اور "ہیروئن" کا بچپن، مراثی میر انیس میں اطفال اہل بیت کا ذکر، سنسکرت اور ہندی کی تصانیف میں ناموران و بہادران ہنود کے حالات طفلی بہت دلکش، موثر اور نہایت لطیف و عمیق جذبات و مضامین سے مملو ہیں لیکن کسی زبان میں ان مضامین کو مستقل تصنیف کی حیثیت نہیں دی گئی اور اس جامعیت اور وسعت نظر کے ساتھ کسی نے نہیں لکھا، جو ٹیگور کے "الہلال" کی مابہ الامتیاز ہے - انگریزی میں "ورڈس ورتھ" اور "بلیک" کی مشہور نظمیں پھر بھی بہت کچھ جدت و نزاکت اپنے اندر رکھتی ہیں اور فلسفۂ طفلی اور بلند و جدید اسلوب بیان کے لحاظ سے اس عنوان کے تحت میں آ سکتی ہیں جس کا خاتمہ ٹیگور کے نام پر ہوا ہے - "کریسنٹ مون" میں ٹیگور نے بتایا ہے کہ بچے کی روح کو خدا کی ذات سے کیا تعلق ہوتا ہے وہ انوار الٰہی سے کیونکر براہ راست مستفیض ہوتا ہے اور کس طرح اس نور کی ضو فشانی دنیا و اہل دنیا پر کرتا ہے - بچہ دنیا کے لئے نہ صرف حسین ترین آرائش ہے بلکہ دنیا کے محاسن اخلاق بھی بچے ہی کی ذات سے وابستہ ہیں بچہ ہمارے دلوں میں رقیق جذبات اور بلند خیالات پیدا کرتا ہے - ہمارے اعمال و مقاصد میں استقلال، محبت و ایثار کی روح پھونکتا ہے ہمارے تعلق کو خدا کے ساتھ قوی و قریب کرتا ہے - یہ مضامین جس انداز میں بیان کئے گئے ہیں وہ ٹیگور کا اور صرف ٹیگور کا حصہ ہیں - اگر ٹیگور صرف یہی نظمیں لکھ دیتا تو اس کو غیر فانی بنانے کے لئے کافی تھیں -

ڈرامے - ٹیگور کے تین ڈرامے انگریزی میں شائع ہوئے ہیں، "چترا"[1] "دی کنگ آف دی ڈارک چیمبر"[2] (کالی کوٹھری کا بادشاہ) اور "دی پوسٹ آفس" (ڈاک خانہ) -

ٹیگور کے ڈرامے صرف معمولی قصے اور حسن و عشق کی داستانیں نہیں۔ بلکہ اُن میں فلسفۂ حیات، فرائضِ زندگی، مسائلِ اخلاق، اسرارِ حسن و عشق بیان کئے گئے ہیں۔ "چترا" کا موضوع یہ ہے کہ حسنِ ظاہری ایسی عجیب اور دلکش چیز نہیں کہ انسان اسی کا ہو رہے۔ بلکہ حقیقی مسرت حسنِ باطن اور جمالِ روح سے حاصل ہوتی ہے۔

دوسرا ڈراما نہایت عجیب اور بہت پُرزور ہے، کال کوٹھری یا کلبۂ تاریک کیا چیز ہے؟ انسان کا دل، اس کا بادشاہ کون ہے؟ خدا۔ دل کی اندھیری کوٹھری میں خدا ہی کی حکومت ہے اور جس دل میں خدا کا نور نہ ہو وہ خانۂ تاریک سے بھی بدتر ہے اس ڈرامے میں دنیاوی حکومت اور خدائی بادشاہت کا مقابلہ نہایت معنی خیز، سبق آموز اور پُراثر ہے۔

تیسرے ڈرامے "پوسٹ آفس" میں مسئلہ موت و حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

فسانے ۔ ٹیگور نے متعدد مختصر فسانے اور چھوٹے چھوٹے ناول بھی لکھے ہیں۔ ٹیگور غالب کی طرح عام سطح سے بلند رہنا چاہتا ہے اور اس زمین پر قدم رکھنا نہیں چاہتا جو پامال ہو چکی ہو، اور یہ بات اس کی ہر تصنیف بلکہ ہر تخیل اور اسلوب بیان میں صاف نظر آتی ہے۔ اسی معیار پر اس کے قصے اور کہانیاں بھی پورے اُترتے ہیں، ان میں بھی بجائے دلچسپ اور پیچیدہ پلاٹ اور رنگینیٔ بیان کے ٹیگور کا پُرزور تخیل اور متین و پُررعب اندازِ بیان کام کر رہا ہے اسی لئے اس کے قصے دلچسپیٔ عوام سے بالاتر ہیں۔

سادھنا ۔ اس کتاب میں ٹیگور کے وہ لکچر جمع کئے گئے ہیں جو امریکہ و انگلستان میں دیئے گئے۔ یہ مجموعہ ملکاتِ فاضلہ کو حاصل کرنے، قوائے خفتہ کو بیدار کرنے اور عظمتِ گم کردہ کو پھر حاصل کرنے کے لئے بہترین رہنما ہے اس میں ہندوستانِ قدیم کی تہذیب، ہندوستانِ جدید کی آئندہ امیدوں، روح کی بیداری، نیکی و بدی کے متعلق نہایت پاکیزہ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔

متفرق تحریریں ۔ جن میں ٹیگور کی مختصر نظمیں، مضامین، خطوط وغیرہ شامل ہیں مشہور انگریزی مجلات و جرائد میں متفرق طور پر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بھی اعلیٰ خیالات، موثر پیرایہ، شاندار الفاظ و اسالیب کے ذریعہ سے ٹیگور کی عظمتِ شخصیت، قدرتِ کلام اور تبحرِ خصوصی کا نمونہ ہیں۔

گارڈنر (باغبان) ہم نے اس کتاب کو تبصرہ کے لئے سب سے آخر میں جگہ دی ہے، اس لئے کہ اسی کے مکمل ترجمے کے لئے (جو کتاب کی صورت میں شائع ہوگا) یہ مضمون اور حیاتِ ٹیگور ترتیب دی گئی ہے اور اس پر ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ "گارڈنر" کا درجہ "گیتان جلی" کے بعد ہی ہے لیکن بعض نقادانِ فن اس کو گیتان جلی پر ترجیح دیتے ہیں۔ انگلستان میں گارڈنر کو گیتان جلی سے زیادہ قبولیتِ عام حاصل ہو گئی ہے۔

ٹیگور نے "گارڈنر" کو نغمات محبت وحیات قرار دیا ہے۔ گارڈنر حسن وعشق کی نہایت دلکش اور اصلی تصاویر کا مرقع ہے اور شاعری کے بلند ترین تخیلات، حقیقی جذبات اور پرزور محاکات کا بے نظیر مجموعہ۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ "گیتان جلی" ٹیگور کے قصائد ہیں، "ڈرامے ٹیگور کی مثنویاں" "کرسینٹ مون" "ٹیگور کی رباعیاں" اور "گارڈنر" ٹیگور کی غزلیں ہیں۔

گارڈنر کی نظمیں جیسا کہ ٹیگور نے اپنے مختصر دیباچہ میں لکھا ہے "گیتان جلی" سے بہت پہلے کی لکھی ہوئی ہیں۔ یعنی "یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا" یہ عالم شباب کے متعلق عہد شباب کی لکھی ہوئی نظمیں بنگالی زبان میں تین کتابوں (سونار تاری، مانسی، چترا) میں شائع ہو چکی ہیں، اس کے بعد خود ٹیگور نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

"گارڈنر" کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ مصر میں اس کا عربی ترجمہ شائع ہو گیا مجلہ "معارف" اعظم گڈھ بابت ماہ مئی ۱۹۲۰ء میں ایک مضمون "ٹیگور عربی لباس میں" شائع ہوا ہے، ہم گارڈنر کے عربی ترجمہ کے متعلق اسی مضمون سے اقتباس کرتے ہیں۔

گارڈنر کو مصر کے ایک اہل قلم ودیع البستانی نے ترجمہ کر کے شائع کیا ہے اور اس کا نام اصل کتاب کے نام اور اپنے نام کی مناسبت سے البستانی رکھا ہے۔ بستانی موصوف فن ترجمہ کا ماہر شاق ہے اور اس سے پیشتر لارڈ اویبری کی مشہور تصانیف "یوز آف لائف" "پلیزر آف لائف" "دی بیوٹیز آف نیچر" وغیرہ کا "معنی الحیاۃ" "مسرات الحیاۃ" "محاسن الطبیعۃ" کے نام سے علی الترتیب ترجمہ کر چکا ہے۔ آج تک رباعیات عمر خیام کا تقریباً دنیا کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، لیکن عربی زبان میں اس کی کمی تھی، اس کمی کو بھی بستانی موصوف ہی نے پورا کیا ہے جو موجودہ ادب عربی میں ایک قابل قدر اضافہ سمجھنا چاہیے۔

مترجم مذکور ٹیگور کی تصانیف کو پڑھ کر ہندوستان میں اس کی ملاقات کو آیا تھا اور اس کی مشہور تصانیف گیتان جلی (قرابین الاغانی)، گارڈنر (البستانی)، کرسینٹ مون (الہلال)، وغیرہ کی بعض جیدہ اور منتخب نظموں کو اس کے پاس سے نقل کر کے لے گیا، جن میں سے بعض کا عربی میں ترجمہ کر کے اس نے مجلہ الہلال مصر میں شائع کرایا تھا۔ مترجم نے (جیسا کہ وہ دیباچہ میں کہتا ہے) گارڈنر کا ترجمہ عربی میں کیا۔ اور پھر عربی کا لفظی ترجمہ انگریزی میں کر کے خود ٹیگور کو دکھایا تھا، جسکو اس نے پسند کیا اور جائز و مناسب تصرفات کو بھی قائم رکھا۔ اس کے بعد یہ کتاب "میکملن اینڈ کو" کی اجازت خاص سے مطبع معارف مصر میں طبع ہوئی۔

ایک مایوس کی آخری تمنا

نویدِ عشرتِ موہوم اب نہ چھیڑ مجھے
امیدِ لذتِ معدوم اب نہ چھیڑ مجھے

خوشی کے نام سے دل کی مصیبتیں نہ بڑھا
دکھا کے جلوۂ راحت کسی کا جی نہ دکھا

گدازِ دل کی رفاقت بہت ہے میرے لئے
"ہو نہیں وہ میری" یہ حسرت بہت ہے میرے لئے

اسیرِ جرمِ محبت ہوں، اب گلا کیوں ہو
کوئی بتائے مجھے خواہشِ وفا کیوں ہو

عزا گسار ہوں "ناکام جستجوؤں کا
نہ ذکر کر مری مرحوم آرزوؤں کا

فسانہ عہدِ تمنا کا اُف، مجھے نہ سُنا
اب ان کے ذکرِ نوازش سے میرا دل نہ دکھا

غمِ فراق ہے، ارماں کو دفن رہنے دے
مجھے اب اُن کے تغافل کا رنج سہنے دے

مرے شباب کی کاوش کا قصۂ دلدوز
ستا کے اور فزوں کر نہ میرے صبر کا سوز

نہ کہہ کہ "اپنی خرابی پہ اشکبار ہوں میں
نہ کہہ کہ عہدِ تمنا کا سوگوار ہوں میں

خدا کے واسطے دے اب تو درسِ بیخبری
کہ فاش ہو چکا عالم پہ رازِ چارہ گری

یہ مدعا نہیں لیکن کہ دردِ ہجر مٹے،
غمِ فراق کی لذت دل و جگر سے چھٹے،

یہ آرزو ہے، کہ وہ دردِ دل کا راز بنے
مرے حریمِ محبت کا وجہِ ناز بنے

میں اس کے دردِ پرستش میں یوں خموش رہوں
کسی سے حالِ دلِ زار و مبتلا نہ کہوں

تپش کو اپنی رفیقِ شبِ محن سمجھوں
میں سوزِ دل کو فقط شمعِ انجمن سمجھوں

کسی کی کچھ نہ سُنوں کوئی کچھ سُنا جائے
مرے وجود پہ اک بیہوشی سی چھا جائے

جہاں سے دور رہے دل کی عافیت کوشی
کرے یہ حال مرا جوشِ خود فراموشی

کہ مجھ کو ہستی کا احساس محو ہو جائے
مری حیات بس اک جستجو میں کھو جائے

جہاں میں یہ مری بے چارگی کا عالم ہو
کہ میرا حالِ زبوں اک صلائے ماتم ہو

نہ آہِ نیم شبی مائلِ رسائی ہو
نہ گریۂ سحری موجبِ رہائی ہو

ہمارے وقتِ سحر جب بلند ہونے لگے
اثر خرابیٔ قسمت پہ میری رونے لگے

یہ حال جو کوئی دیکھے وہ کہہ اُٹھے اک بار — کہ اب تو رحم کے قابل ہے اسکی حالتِ زار
کوئی کہے کہ دوا کا نہ کیا اثر ہو گا؟ — کوئی کہے نہیں درماں نہ کارگر ہو گا
اب اس کو چھوڑ دو یوں ہی نہ اس پہ جبر کرو — دوا کا وقت نہیں ہے دعائے صبر کرو
عیاں ہو جب کہ دوا و دعا کی بے اثری — تو اتنا یاد رہے اے وفورِ بے خبری
کبھی وہ حُسنِ مجسم جو سامنے آئے — اور اپنے جلووں سے خورشید و مہ کو شرمائے
جب اس کے عارضِ گلگونئ شعلہ سامانی — شفق کے رنگ کی زائل کرے درخشانی
اور اس کی موجِ تبسم سے نشتہ باری ہو — فضا میں ہر طرف اک محویت سی طاری ہو
تو خوابِ یاس سے مجکو ذرا جگا لینا — حجابِ دید مری آنکھ سے اُٹھا لینا
کہ میں بھی اس رخِ رنگیں پہ اک نظر کر لوں — وفورِ شوق میں بڑھ کر قدم پہ سر رکھ دوں

امید و بیم میں جس دم مجھے غش آنے لگے
وہ میری حالتِ نازک پہ مُسکرانے لگے

مخمور

موٹر اور ریل کے تصادم سے حفاظت دنیا کے بڑے بڑے متمدن اور آباد شہروں میں اکثر تصادم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں ہر دو منٹ پر ایک گاڑی چھوٹتی ہے۔ راستہ میں ریل کی سڑک پر سے موٹروں کا راستہ بھی ہوتا ہے جو ہر گھنٹہ میں سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ریل کی سڑک کو عبور کرتی ہوئی گذرا کرتی ہیں ایسے مواقع پر اکثر تصادم کے واقعات ہو جایا کرتے ہیں۔ اس شدید نقصان سے بچنے کیلئے زمانۂ حال کے بعض مخترعین نے ایک ایسی روک ایجاد کی ہے جو موٹر کو تدریجاً کھڑا کر دیتی ہے اور موٹر چاہے کتنی ہی تیزی سے آ رہا ہو آہستگی سے رکجاتا ہے اور سواروں کو کچھ نقصان نہیں پہونچتا۔ یہ روک موٹے موٹے تاروں کا ایک جال ہے جس میں ہر طرف کمانیاں لگی ہوتی ہیں۔ جب ایک طرف گاڑی اور دوسری طرف سے موٹر آتا ہے تو یہ جال فوراً تان دیا جاتا ہے۔ موٹر جال سے آکر ٹکراتا ہے۔ لیکن چونکہ جال میں کمانیاں لگی ہوئی ہوتی ہیں اس لئے اس کے ساتھ سخت تصادم نہیں ہوتا۔ بلکہ موٹر آہستگی سے اس جال کو دبانا شروع کرتا ہے یہانتک تمام موٹر کی طاقت جال کے دبانے میں صرف ہو جاتی ہے اور ریل سے ٹکرانے سے پہلے وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔

نقص تربیت

(از آغا حیدر حسن دہلوی)

رقیہ سرخ پوشوں کی گلی میں کرائے کے چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ جمیل اور ماہ رو میں کچھ مار کٹائی ہوئی۔ ماہ رو ایسی بلبلا کے روئی کہ ماں گھبرا گئی۔ سلائی کے کپڑے یوں ہی چرپائی پہ پھینک، جلدی سے جوتی میں پاؤں ڈال کر بیٹے کو مارنے بھاگی۔ جمیل بیٹا ذات۔ بھلا وہ کیا ہتے چڑھتا۔ بہن کو مار۔ باہر گلی میں نکل گیا۔ یہ بھی جلدی سے دروازے پہ پہونچی۔ دروازے پر پھٹی دری کے پیوند لگا ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا۔ مارے غصے کے آدھے سے زیادہ دھڑ باہر نکال دیا۔ اور لگی بیٹے پہ گرجنے برسنے۔ او ہے موئے۔ او دواڑے کے باوا ظلمی کہیں کے۔ جوانا مرگ جائیا۔ آئے نا تجھے ڈھائی گھڑی کی۔ نامراد کیسا میری بچی کو مار گیا۔ صدقے میں دوں تجھے اس جگہ پہ سے۔ جہاں میری بچی کی وائی نے ہاتھ دھوئے۔ ایسی کیا تیرے کلیجے میں چٹکی توڑلی۔ اندر ذرا آ۔ کھانہ جاؤں تو سہی۔ ٹوٹیں تیرے ہاتھ نگوڑا اغارتی کہیں کا۔

جمیل۔ بی اماں یونہی خفا ہوئے جاتی ہو۔ کسی اور کی بھی سنو گی؟ اس نے مجھے بے ناحق گالی دی۔

رقیہ۔ ہو گی کوئی مالزادی تیری اماں۔ نگوڑا۔ گھر میں سنپولیا ہوا ہے۔ گالی دی تو اچھا کیا۔ ہے ہی تو اس قابل موئے جوتیوں خورے۔ اٹھتے جوتی بیٹھتے لات رہے تو ٹھیک ہے۔ جانہار۔ ناشاد۔ ایسی تجھے کیا گالی دی۔ جو تیرا کلیجہ چھد گیا۔ موت نہ لے! خدا کی قسم نہ آیا تو مار ہی ڈالونگی۔

جمیل۔ میں نے اس علامہ کا کیا بگاڑا تھا۔ جو مجھے ان نے انگریز کہا۔ ہم تو اسے چاہیں۔ رتی میں سے رتی دیں۔ حلق کا نکال کے کھلائیں۔ اس پہ ہمیں انگریز کہے۔ تم ہی منصفی سے کہنا۔ میں حرام خور ہوں سور کھاتا ہوں پھر کیوں کہا ان نے۔

رقیہ۔ الّدری مکارہ کیا فیل مچائے ہیں۔ اپنی کوئی خطا ہی نہ بتائی۔ تجھے شرم نہ آئی بڑے بھائی کو انگریز کہا۔ جد ان نے مارا۔ تو اپنی دفعہ کو کیا کیا لوٹی ہے۔ کیا کیا پٹی ہے۔ افوہ ری حرافہ تیری حرفتیں میں ہی خوب جانتی ہوں ٹھیر کل تیری اُستانی سے جا کے نہ کہا تو جدھی کہیو۔ آج کو بھائی ہے۔ کل کو خصم ہوگا۔ دوسرے ہی دن چوٹی کاٹ ڈیا واپس کر دیگا مجھے نہ معلوم تھا۔ یہ تجھ میں گن بھرے پڑے ہیں۔ اچھا اُستانی نے سبق پڑھایا۔ کسی کے گھمنڈ پہ نہ رہیو۔ تکلے کے سے بل نکال دونگی۔ زیادہ دلاڈ میں نہ آئیو۔ تا جو کہیں کی۔ بھائی کو دیکھ نہیں سکتی۔ ان نے تو ایک ہی بہ چٹے خنے پہ چھوڑ دیا۔ مجھ دال کا ہوتا۔ تو چھریوں کے غسل کراتا۔ اوپر سے دھیئے مچانے تو دیکھو۔ راہ چلتے مردوے سنیں۔

انگریزن کہیں کی۔ ذرا شرم نہیں۔ ذرہ برابر غیرت نہیں۔ ابھی فرنگیت چھائی ہے۔ لونڈوں کے ساتھ گدکڑے لگوالو۔ بہو
بیٹیوں کی طرح کونے میں جی ہی نہیں لگتا۔ ڈوبی وہی ہے انگریزیت میں۔ جب دیکھو ہشت ہشت۔ جب دیکھو چھینگا
مشتی۔ یوں عورت سے زیادہ ہونے کو آئی۔ بے بہرہ مستانی چلی جا گرجا۔ اچھی ہی استانی بیچاری۔ تانس کے رکھا
ہی نہیں جاتا۔ دُہائی باوا میں ایسا مدرسہ پڑھوانے سے۔ لونڈیا ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ اب تو کسی کا ڈر ہی نہیں
مانتی۔ بیٹی ذات اور گیند بلا دیکھو۔ کولھے پہ ہاتھ رکھ کے ناچنا۔ تھرکنا۔ پھدکنا دیکھو۔ فرنگن زادی۔ نگوڑے چہرے پہ
ابھی سے ٹھیکرے ٹوٹنے لگے۔ یہ کرسٹانیوں کی صحبت کا اثر ہے۔ نہ آئے کی شرم نہ گئے کا لحاظ۔ دیدے کا پانی
ہی ڈھل گیا۔ انگریزن بچی۔ شہدن۔ بے شعور۔ دور ہو چل۔ اندر جا کے بیٹھ۔ کام پہ دیدہ ہی نہیں ٹکتا میری ملکہ وکٹوریا کا۔
ماہرو ایسی ایانی تو تھی نہیں۔ اتنی باتیں سنتی اور سہار جاتی۔ مشن کی پڑھنے والی۔ بڑی مس کی ناک کا بال۔
پانچ برس کا کیڑا کیا ہوتی ہے۔ اس وقت سے اس دم تک سایہ والیوں کی صحبت رہی۔ برابری رگ رگ ریشے
میں سرایت کر گئی۔ ماں سے دبتی اسکی جوتی۔ جو جو منہ میں آیا۔ دو بدو سنایا۔ ماں بھی ایک جلادن۔ ٹانگ برابر چھوکری
کی یہ برابری دیکھ۔ آپے سے باہر ہو گئی۔ نکال پاؤں سے جوتی۔ خوب ہی چندیا تو کی۔ گیارہ برس کی دھتوا۔ دہکیوں
پٹتی۔ لپٹ پڑی۔ ناخنوں سے سلا منہ خونم خون کر دیا۔ ادھم مچی۔ ہمسائیاں۔ دیواروں پہ چڑھ آئیاں۔ بیری والی
ہمسائی جو کھڑکی میں سے نہ آئیں۔ اور بیچ بچاؤ نہ کرائیں تو دونوں میں سے ایک کا فیصلہ ہی ہو جائے۔ ہمسائیاں
ماں کی رشتی لیتیں۔ بیٹی کو پرچک دیتیں۔ بٹیا۔ ماں بیٹیوں کی بڑھتی دیکھ پہلے ہی سے سٹک گیا تھا۔ آیا۔ گیا۔ اپنا۔
پرایا۔ سب ایک منہ ہو گیا۔ ماہرو کو بڑا گھمنڈ مس جلینا اور فادر جان کا تھا۔ وہ ہوتے تو شاید بچاری کی حامی پیتے۔
مشن کی ڈولی آئی۔ تو ماں نے کہاروں کو للکار بتائی۔ اس دن جو یہ مدرسے نہ گئی۔ تو شام کو ہوا خوری سے واپسی
کے وقت بڑی مس کھڑے آئیں۔ ماں نے آنکھوں میں رکھا۔ تنہائی کا موقع نہ دیا۔ لیکن اُستانی
شاگرد میں جانے کیا گٹ پٹ ہوئی۔ اور استانی جی سدھاریں۔ رقیہ پہلے ہی تھی دھان پان۔ آئے دن کی مرضیں
اوپر ڈھینگڑی بیٹی سے کشتم کشتا ہوئی۔ دھڑکن کا زور ہوا۔ سارے دن لوتھ ہوئی پڑی رہی۔ کس کا کھانا کس کا
دانا۔ بکنا رندھنا کیسا۔ اول شام ہی سے پڑ رہی۔ میاں کا زخم تازہ ہی تازہ تھا۔ لوئیاں اور دریاں لینے امرتسر گیا تھا۔
نگوڑی کا راج لٹنا تھا۔ جو جلیانوالے میں جھلسا پھر لاش تک کا پتہ نہ لگا۔ جمیل اور ماہرو اوپر تلے کے بہن بھائی تھے۔ برس
دن کا چھٹا بڑا پا تھا۔ سال بھر کی سوڑھ رقیہ کی تھی۔ کچے پکے ملا کے نو ہوئے۔ چھیچ چھچا کے یہ دو رہے۔ جمیل کی بساط
ہی کیا تھی۔ بارھواں سال۔ چھوٹی سی دوکان سنبھالے بیٹھا تھا۔ ایسی حالت میں بڑھائی وڑھائی کیا خاک ہوتی

صبح کی حسرات میں کچھ کھا کے نہ گیا تھا۔ سارے دن کا بھوکا پیاسا۔ لخ لخ کرتا آیا۔ گھر میں اندھیرا۔ چولھا اوندھا۔ ماں سے پوچھا۔ واجبی سا جواب دیا۔ اور پڑی رہی۔ کیا مقدور جو میل نے دم بھی مارا ہو۔ چپ ہو رہا۔ ماں کی ماتا پھر دل نہ مانا۔ اٹھی۔ روٹی کے ٹکڑے کوٹ۔ گڑ ڈال ہتیلی چڑھا دی۔ پکا۔ بچے کے آگے لا دھرے۔ کوئی ہنسی تو تھی نہیں۔ مغل کا خون تھا۔ جلال ابتک نہ اترا تھا۔ خود تو نہ کھا۔ چپکے سے بیٹے کو اشارہ کیا۔ کہ بہن کو بھی کھلا لو۔ اس نے بہن سے کہا۔ وہ آئی اور اپنے کھانے بیٹھ گئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ لیکن ماں نے زبان پہ بھی رکھا ہو تو بری چیز کے برابر۔ بیٹے نے بھتیرا کہا۔ کھایا پر نہ کھایا۔ بیٹی نے کھا پی سب برابر کیا۔ رقیہ کو رنج صدمے میں ایسی غفلت کی نیند آئی تھی۔ کہ مُردوں سے شرط بد کر سوتی۔ بچے کھاتے ہی رہے۔ اور وہ ہو رہی۔ بچہ بھی سارے دن کا تھکا ہارا۔ گھوڑے بیچ کے سویا۔ ماہ رو تھی تو گیارہ برس کی۔ پر تھی بڑی شتّا۔ اچھے اچھوں کے کان کاٹتی تھی۔ دم چرائے پڑی رہی۔ آدھی رات ہوئی تو تانی کی آواز آئی۔ چپکے سے اُٹھی۔ جا کے کنڈی کھولی۔ بڑی مس، دوا درم دو بڑ کالے کالے جتے پہنے صلیبیں گلے میں پڑی گلی کی قندیل کی روشنی میں صاف معلوم ہو رہی تھیں۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ "ماہرو خداوند یسوع مسیح تم کو برکت دے"۔ یہ کہہ اور اپنے ساتھ لے۔ یہ جا۔ وہ جا۔ صبح ہوئی۔ کھٹولی خالی تھی۔ ماں نمانی کو اسکا سان گمان بھی نہ تھا۔ کہ بیٹی یہ کھیل کھیلے گی۔ اٹھی۔ کنڈی خلاف معمول کھلی پائی تو ذرا گھبرائی۔ بیٹے کو ہشیار کیا۔ ادھر ڈھونڈا ادھر ڈھونڈ۔ جب ڈھونڈ ڈھونڈھا چکی تو بیقرار ہو آوازیں دیں۔ ہوتی تو آتی۔ بچے کو باہر بھیج سب طرف ڈھنڈوایا۔ نہ ملی تو چادر ڈال عمر بھر میں پہلی دفعہ باہر نکلی۔ کلیجہ پکڑے پکڑے پھرتی گلی گلی بازار بازار زار قطار روتی۔ ہر ایک سے پوچھتی۔ تھانہ کچہری سب ہی کیا۔ بچی کا پتہ چلنا تھا پر نہ چلا۔ کلکتے اور صوبوں کے مقامی لاٹھ پادری جو ہزاروں کی تنخواہ ہندوستان کی آمد سے پاتے ہیں۔ وہ مفت میں نہیں ملتی۔ کچھ تو کارگذاریاں ہوں۔ جو ایک دفعہ پھنس جائے اور پھر نکل جائے تو ایسے بھولے نہیں۔ آخر بیچاری رو پیٹ۔ صبر کر بیٹھ رہی۔ قصور کس کا۔ ماں کا یا بیٹی کا۔ یا یہ بڑی ڈاڑھی والے مولویوں کا۔

شاہد حسن ترا، در روش دلبری — طرۂ پرخم صفات موئے میانِ ماسوا

مہر ترا شمع و گل، خستگی بوتراب — سازِ ترا زیر و بم، واقعۂ کربلا

غالب

امیر عبدالقادر جزائری

امیر عبدالقادر ناصر الدین جزائری مئی ۱۸۰۸ء میں قریہ قیطنہ میں پیدا ہوا، جو الجیریا کے صوبہ وہران میں واقع ہے۔ اس کا سلسلۂ نسب امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ اس کے والد بزرگوار امیر محی الدین اکابر علما میں تھے اور اپنے اخلاق و عادات اور خاموش زندگی کے لحاظ سے الجیریا میں بہت مشہور تھے۔

امیر محی الدین نے جب اپنے ہونہار فرزند میں ذکاوت فطری اور خداداد ذہانت کے آثار دیکھے تو اس کی تعلیم اور تربیت میں انتہائی کوشش صرف کی۔ چنانچہ تھوڑے عرصہ میں عبدالقادر نے قرآن حفظ کر لیا اور علوم متداولہ میں بھی کافی دستگاہ حاصل کر لی۔

امیر عبدالقادر کو ابتدائے عمر سے گھوڑے کی سواری کا بڑا شوق تھا جب سترہ برس کا سن ہوا تو اس کی شجاعت، جسمانی طاقت اور شہسواری تمام ملک میں ضرب المثل ہو گئی۔ سواری میں اس نے ایسی مہارت پیدا کی کہ تیز سے تیز چلنے والے وحشی جانور کو گھوڑے پر چڑھکر دم بھر میں شکار کر لیتا تھا، لیکن باایں ہمہ سیر و شکار کے مشاغل اُسے فرائض دینی کی طرف سے غافل نہ رکھتے تھے۔

نومبر ۱۸۲۵ء میں عبدالقادر نے اپنے والد کے ساتھ میں سفر حج کیا، راستہ میں جب اپنے حشم و خدم کے ساتھ قاہرہ سے گذرا، تو مصر کے فرمانروا محمد علی پاشا نے ان دونوں کی بڑی قدر کی اور نہایت عزت و احترام سے پیش آیا۔ پھر حجاز کا قصد کیا اور فریضۂ حج سے فارغ ہو کر دمشق کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں ایک عرصہ تک قیام کر کے، مزار حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی زیارت سے مشرف ہونیکے لیئے بغداد کا قصد کیا۔ بغداد کے عمائد و اکابر نے بھی انکی بڑی عزت کی، پھر وہاں سے دوبارہ حرمین شریفین کی طرف روانہ ہوئے اور زیارت سے مشرف ہو کر ۱۸۲۸ء کے اوائل میں اپنے وطن کو مراجعت کی۔

امیر عبدالقادر نے اس طویل سفر میں بھی تحصیل علم ہی کی طرف توجہ رکھی اور وطن واپس آکر صرف کتب بینی اپنا شعار قرار دیا۔ فلسفہ میں رسائلِ افلاطون، فیثاغورس، اور ارسطاطالیس کا نہایت عمیق مطالعہ کیا۔ فقہ، حدیث، جغرافیہ، ہیئت، تاریخ اور طب میں بھی بڑی مہارت پیدا کی، اور اس زمانے کی بہترین کتابوں کا ایک زبردست کتب خانہ جمع کیا۔

۱۸۳۰ء میں فرانس نے الجزائر (الجیریا) پر قبضہ کیا اور سرکاری اعلانات شائع کیے گئے اس ملک کو فرانس نے سلطنت عثمانیہ کے قبضہ سے نکال کر اپنے تسلط میں کر لیا ہے۔ عربی قبائل جو کسی غیر مسلم حکومت کا اقتدار اپنے اوپر پسند نہیں کرتے اس سے سخت برافروختہ ہوئے اور سب متفق ہو کر فرانسیسیوں پر ٹوٹ پڑے۔ فرانسیسی فوج جو جبل اطلس تک پہنچ چکی تھی، عربی حملہ کی تاب نہ لا سکی اور بری طرح شکست کھا کر ساحل تک پسپا ہو گئی۔ وہاں اُس نے اپنے حواس درست کر کے دوبارہ حملہ کیا اور شہر "وہران" پر قبضہ کر لیا۔

فرانس کی بیجا مداخلت اور سلطنت عثمانیہ کے اسلامی سایہ کے زائل ہو جانے سے ملک میں ہر طرف بدامنی پھیل گئی۔ اور ہر قبیلہ جو ایک نظام کے ماتحت تھا خودسر ہو گیا۔ سرداران عرب اور رؤسائے قبائل نے جن میں امیر محی الدین بھی تھے متفق ہو کر ایک عام جلسہ کیا کہ سلطان مراکش کے ساتھ اتحاد پیدا کرنا چاہیے چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک وفد عبدالرحمٰن (سلطان مراکش) کی خدمت میں بھیجا گیا۔ سلطان نے ان کی استدعا قبول کی اور تمام الجیریا نے انہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اور تمام الجزائر میں اُن کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ جب فرانس کو اس کی خبر ہوئی تو اُس کے غصہ کی کوئی حد نہ رہی فوراً اس نے سلطان کے پاس یہ تہدید آمیز اطلاع بھیجی کہ یا تو سلطان اپنی تمام فوج الجیریا سے واپس بلا لے ورنہ ہماری طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ سلطان فرانسیسی فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے مجبوراً امراکشی لشکر کو الجزائر سے واپس ہونا پڑا۔ اب پھر غریب اہل جزائر بلا سرپرست کے رہ گئے۔ آخر سب نے اتفاق کر کے یہ تجویز قرار دی کہ امیر محی الدین کو اپنا سلطان مقرر کریں۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے سرداران جزائر قریہ قیطنہ کی طرف روانہ ہوئے اور امیر موصوف کی خدمت میں اپنی استدعا پیش کی۔ اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہی۔ ابتدا میں امیر نے انکار کیا لیکن جب انہوں نے قتل کی دھمکی دی تو کہا اس پُرآشوب زمانہ میں اتنی بڑی ذمہ داری کا بار مجھ سے نہیں اُٹھ سکتا اگر تم میری جگہ میرے بیٹے امیر عبدالقادر کو تجویز کرو تو زیادہ مناسب ہوگا۔ سب نے اسے منظور کر لیا اور امیر عبدالقادر کے پاس پہونچے امیر موصوف اُس وقت قلعہ خلیب پر فرانسیسیوں سے برسرپیکار تھا۔ سرداروں نے وہاں پہنچکر اس سے بیعت کی۔ اُس وقت امیر عبدالقادر کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔ بیعت لینے کے بعد امیر جامع مسجد میں گیا اور ایک نہایت فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا جس میں بادشاہ کی اطاعت اور خلفائے راشدین کے اتباع کی لوگوں کو ترغیب دی۔ اور سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ مختلف قبائل میں اتحاد پیدا کر کے سب کو دشمن کے مقابلہ میں جسم واحد کر دیا اور اپنے دشمن پر متعدد مقامات میں فتح حاصل کی، خاص کر واقعہ وہران میں اسے بڑی کامیابی ہوئی۔ اسوقت

فرانسیسی فوج جنرل میشیل کے قیادت میں تھی۔ امیر عبدالقادر کے حملے جو صرف دفاع وطن اور حفاظت مذہب کے سچے جذبات پر مبنی تھے نہایت کامیاب ثابت ہوئے اور فرانسیسی فوج کے دل پر انکا رعب چھا گیا۔

حکومتِ فرانس نے، جو تمام الجزیا پر قبضہ کرنا چاہتی تھی، عبدالقادر کی طاقت کو دیکھتے ہوئے مناسب نہ سمجھا کہ فی الحال ایک بڑی فوج سے امیر پر حملہ کیا جائے بلکہ اس نے جنرل میشیل کو حکم دیا کہ امیر سے صلح کی سلسلہ جنبانی کرے۔ چنانچہ جنرل مذکور نے ۱۸۳۴ء میں چند مناسب شرائط پر ایک عہد نامہ کر لیا۔

جب اس طرح حالات میں کچھ سکون ہوا تو امیر عبدالقادر اپنے داخلی انتظامات کی طرف متوجہ ہوا۔ اسلحہ جنگ کی تیاری کے لئے کارخانے کھولے، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ لڑائی ایک دفعہ اور ہوگی۔ چنانچہ امیر عبدالقادر بھی برابر طیاریوں میں مصروف رہا، کارخانوں میں توپیں ڈھلوائیں بارود بنوائی اور فوج کو جدید اصول پر قواعد سکھائی، ان انتظامات کیلئے چونکہ مصارف کی زیادہ ضرورت تھی اس لئے امیر نے حکم دیا کہ تمام قبائل مویشی کی شرعی زکوٰۃ ادا کریں۔ بعض قبائل اس کے خلاف ہو گئے لیکن امیر نے اپنی دانشمندی سے انہیں بھی اپنے قابو میں کر لیا۔

امیر عبدالقادر کی روز افزوں طاقت کو دیکھ کر فرانسیسیوں سے نہ رہا گیا اور جنرل اورلین نے جو اُس وقت فرانسیسی افواج کا سپہ سالار تھا امیر کے پاس اطلاع بھیجی کہ وہ اپنے حدود سے تجاوز کر کے وہران سے پاؤں باؤں نہ نکالیں۔ امیر نے جواب دیا کہ میرے دائرہ حکومت کے لئے معاہدہ میں کوئی حد مقرر نہیں کی گئی تھی اسلئے مجھے پورا اختیار ہے کہ جس قبیلہ کو چاہوں اپنے زیر حکومت کر لوں۔ کچھ دنوں تک فریقین میں گفت و شنید ہوتی رہی لیکن امیر کے مطالبات پر فرانسیسی راضی نہ ہوئے۔ امیر بھی اُن کے دلی مقصد سے خبردار تھا اسلئے اس نے بعض قبائل کو جو وہران کے باہر رہتے تھے حکم دیا کہ اندرون ملک میں چلے آئیں لیکن چونکہ یہ لوگ فرانسیسیوں سے ڈرتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے فرانسیسیوں سے استدعا کی کہ انہیں اپنی حمایت میں لے لیا جائے، امیر نے اُدھر فرانس کو اطلاع دی کہ ہم ہرگز ان قبائل کو اپنے قبضہ میں نہیں کر سکتے۔ ادھر قبائل علی الاعلان امیر سے باغی ہو گئے اور پانچ ہزار پیادہ فوج سواروں کی ایک جماعت اور چند توپیں لیکر امیر پر حملہ کیا، لیکن بعد کو بعض اہل الرائے نے مشورہ دیا کہ امیر سے لڑنا مناسب نہیں واپس چلا جانا چاہئے۔ امیر کو خبر ہو گئی کہ وہ ایک غیر معلوم جہت کو جا رہے ہیں۔ امیر نے اس فرصت سے فائدہ اُٹھایا اور اُن پر ٹوٹ پڑا۔ اور ایک گھاٹی میں سخت مقابلہ کے بعد انکا استیصال کر دیا۔

جب امیر کی اس شاندار کامیابی کی خبر فرانس میں پہونچی تو پیرس کے تمام اخبار اور قومی خطیب حکومت

کو امیر کے خلاف آمادہ کرنے لگے اور مشورہ دیا کہ اس بدوی امیر کے مقابلہ کو ایک زبردست فوج بھیجنی چاہئے۔ عبدالقادر کو بھی تمام باتوں کی خبر ہوتی رہتی تھی کیونکہ اس کے پاس فرانس کے تمام اخبارات آتے تھے اور ماہر مترجمین تمام حالات سے اُسے آگاہ کرتے رہتے تھے۔

آخر کار نومبر ۱۸۳۵ء میں فرانس کی فوجیں وہران پر حملہ آور ہوئیں، امیر بھی مقابلہ کو نکلا لیکن اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اور اپنے پایۂ تخت مسکرا کی طرف واپس ہوا۔ لیکن فرانسیسی لشکر پہلے سے مسکرا میں مقیم تھا اسلئے اس وقت امیر کے یاس وغم کی کوئی حد نہ تھی۔ چند دنوں کے بعد فرانسیسیوں نے بلا کسی سبب کے مسکرا کو خالی کردیا۔ اور امیر نے اپنے مستقر میں جا کر قیام کیا۔ اور اس کی فوج دوبارہ اس کے گرد جمع ہوگئی۔ پھر امیر نے ان لوگوں کو معقول سزائیں دیں جنھوں نے اس جنگ میں اُسکی نافرمانی کی تھی۔

فرانسیسی شہر تلمسان میں پہونچے شہر والوں نے بڑی خوشی سے اُن کا خیر مقدم کیا لیکن فرانسیسیوں نے شہر کے یہودیوں پر ناقابل برداشت ٹیکس لگانے شروع کئے، یہودیوں نے عذر کیا، مگر جبراً ان سے وصول کرلیا گیا۔ جب یہودیوں نے فرانس کا یہ طرز عمل دیکھا تو وہ اپنے کئے پر بہت نادم ہوئے اور پھر امیر عبدالقادر کی ماتحتی میں جانا چاہا۔ یہود کی اس خواہش سے امیر کی ہمت بھی بڑھ گئی اور اس نے حملہ کرکے شہر کو فرانسیسیوں سے خالی کرالیا۔

جب پیرس میں اسکی خبر پہنچی تو وہاں سے بطور کمک کے اور فوجیں روانہ کی گئیں اور امیر عبدالقادر نے ان سے متعدد معرکوں میں مقابلہ کیا، لیکن ایک معرکے میں اُسے فاش شکست ہوئی کیونکہ بعض خائن عربوں نے اس کے خلاف بغاوت کی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ایک قاضی (جس کا نام سید ابراہیم تھا) چاہتا تھا کہ امیر عبدالقادر کو معزول کرکے خود بادشاہ بن جائے اور اپنے اس مقصد کے لئے بہت سے عربوں کو اس نے اپنے ساتھ متفق کرلیا تھا۔ جب امیر کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے اپنی تلوار برہنہ کرکے گھوڑے کے زین سے لٹکائی اور قسم کھائی کہ جب تک اس خائن کا سر کاٹ نہ لوں گا تلوار میان میں نہ رکھوں گا۔ پھر اس ملت فروش قاضی کے مکان پر پہونچا اور اس کے باہر لانے کا حکم دیا۔ لوگوں نے اسے حاضر کیا اس حال میں کہ وہ خوف سے کانپ رہا تھا امیر نے تلوار کی ایک ضرب سے اس کا سر تن سے جدا کردیا۔ لوگوں کے دل پر اس واقعہ سے بڑا اثر پڑا اور امیر کا رعب اُن کے دلوں میں بیٹھ گیا۔ اور وہ سب امیر کے ساتھ متفق ہوگئے اور اپنی جانیں فدا کرنے میں کچھ دریغ نہیں کیا۔ امیر انہیں لیکر چند مواقع پر حملہ آور ہوا اور فرانسیسیوں کو بڑی زک پہونچائی۔ جب لڑائی نے زیادہ طوالت

اختیار کی اور ذخیرہ فریقین کے پاس کم ہوگیا تو یہ طے پایا کہ جانبین میں تجارتی تعلقات قایم ہوجانے چاہیئں تاکہ ہر ایک فریق دوسرے سے اپنی ضروریات خرید سکے۔ چنانچہ یہ قرارداد منظور ہوئی اور حالات میں کچھ سکون پیدا ہوگیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد فرانسیسی حکومت کی طرف سے جنرل بوجیڈ وہران کی طرف روانہ ہوا اور فرانسیسی لشکر کو لڑائی پر آمادہ کیا تاکہ امیر اور اس کی فوج کو بالکل تباہ کردیا جائے اگر وہ ذیل کے شرائط منظور نہ کرے۔

۱- امیر فرانس کی سیادت کا اعتراف کرے۔

۲- اس کی حکومت دریائے خلیف تک محدود رہے۔

۳- امیر فرانس کو سالانہ خراج ادا کرے۔

امیر عبدالقادر کی غیرتِ وطنی ان شرائط کو قبول کرنے کی کب اجازت دے سکتی تھی۔ اس نے فرانس کو جواب دیا کہ فرانس کے لئے کوئی حق نہیں ہے کہ اس قسم کے شرائط ہم پر عائد کرے کیونکہ اس وقت تک جنگ میں غالب اور مغلوب متعین نہیں ہوئے ہیں۔ فرانسیسی جنرل کو یہ جواب ناگوار تو ہوا مگر اُس نے مصلحتاً صلح کو جنگ پر ترجیح دی کیونکہ وہ خوب سمجھتا تھا کہ اُس کا مقابل کوئی معمولی دشمن نہیں ہے بلکہ شجاعت، ہمت اور غیرت قومی کا عدیم المثال نمونہ ہے۔ اس کے بعد فرانسیسی جنرل نے اپنی حکومت سے صلح کے متعلق گفت وشنید شروع کی لیکن وہ حکومت کو صلح پر راضی نہ کرسکا۔ اور پھر جنگ شروع کردی لیکن چونکہ اُس کی فوج اس قابل نہ نکلی کہ امیر کا مقابلہ کرسکے اس لئے اسنے دوبارہ اپنی حکومت کو صلح پر آمادہ کیا اور بڑی کوشش کے بعد اس میں کامیاب ہوسکا اور ۲۰ر مئی ۱۸۳۷ء کو فریقین میں معاہدہ ہوا جو معاہدہ تافنا کے نام سے مشہور ہے جسکی دفعات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ امیر اپنے ملک کے سواحل میں سے کوئی حصہ بغیر مشورہ فرانس کے کسی اجنبی حکومت کو نہیں دے سکتا۔ اور امیر کا سفیر فرانس میں اور فرانس کا سفیر امیر کے پاس رہا کرے گا۔

جب امیر عبدالقادر معاہدہ کرکے کچھ مطمئن ہوا تو پھر اپنے داخلی انتظامات کی طرف متوجہ ہوا۔ اسلحہ سازی اور جنگ کی تیاریاں نہایت سرگرمی سے شروع کردیں۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ فرانس نے اس وقت مجبوراً صلح کی ہے وہ موقع پاکر پھر جنگ چھیڑ دے گا۔ اس اثنا میں بعض قبائل نے سرکشی بھی کی لیکن امیر نے اپنی حسن تدبیر سے پھر انہیں قابو میں کرلیا۔

اس کے بعد امیر نے ایک نیا شہر بسایا جس کا نام تقدمہ رکھا اور اسے تجارت کا مرکز بنایا۔ مناسب مواقع پر قلعے اور استحکامات بھی بنوائے اور فوج کو یورپین طریقہ پر ترتیب دی اور اس ضرورت کے لئے یورپین افسروں کو بلوایا۔ تلمسان میں اور دوسرے شہروں میں اسلحہ سازی کے کارخانے قایم کئے۔ معادن نکالنے، صنعت، تجارت، اور زراعت کو ترقی دی، اشاعت علم سے بھی غافل نہیں رہا اور چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی مدارس جاری کئے۔ اُس کا ارادہ تھا کہ "تقدمہ" میں ایک زبردست یونیورسٹی قایم کی جائے جس میں تمام علوم اسلامی اور علوم جدیدہ کی تعلیم ہو۔ اسی زمانہ میں امیر نے چاندی اور تانبے کے سکے بھی بنائے جس میں ایک طرف ھذہ مشیئۃ اللہ و علیہ توکلت اور دوسری طرف ضرب فی تقدمہ السلطان عبد القادر منقوش تھا۔

انتظام حکومت میں امیر بڑی ہوشیاری اور بیداری سے کام کرتا تھا یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی بذات خود تحقیق کرتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ فرانس نے اُسے ترقی کرنے کی مہلت نہ دی اور امیر کی حدود حکومت میں تجاوز کرنا شروع کیا۔ امیر نے فرانس کو اطلاع دی کہ یہ حرکت عہد نامہ کے بالکل خلاف ہے لیکن فرانس نے بجائے اس کے کہ امیر کے ساتھ انصاف کرتا اُلٹا اس پر یہ الزام لگایا کہ تم نے عہد نامے کی فلاں دفعہ کی خلاف ورزی کی ہو۔ جب باوجود طویل مراسلت کے امیر نے فرانسیسی رویہ میں کچھ تبدیلی نہ دیکھی تو مجبوراً جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اور فرانس کے قائد لشکر اور موسیو ٹیرس وزیر اعظم فرانس کے پاس اطلاع بھیجی کہ فرانس اگر موجودہ طرز عمل پر قایم رہا تو اس کا نتیجہ بجز خونریزی اور نقض امن کے اور کچھ نہیں ہے مگر اس کے جواب میں فرانس نے بجائے مصالحت قایم رکھنے کے جنگ کی طیاریاں شروع کر دیں۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ شاید ان طیاریوں کو دیکھ کر امیر ڈر جائے اور ہماری شرائط قبول کرلے مگر امیر اپنے عزم پر برابر قایم رہا اور فریقین میں ایک سخت جنگ ہوئی جس میں فرانسیسی فوج کو پسپا ہو کر ساحل کی طرف بھاگ جانا پڑا۔

فرانس کو یہ شکست نہایت شاق گذری اس لئے اس نے تازہ دم فوجیں مدد کے لئے بھیجنی شروع کیں جس سے فرانسیسیوں کے قدم پھر جم گئے اور جبل اطلس کے قریب امیر کو شکست ہوئی۔ امیر کی فوج اس وقت یورپین ترتیب سے لڑ رہی تھی لیکن امیر نے پھر نظام فوجی بدل کر پرانا طریقہ اختیار کیا جس میں اُسے بہت کامیابی ہوئی اور دشمن کو پسپا کر دیا۔ اس کے بعد یہ جنگ چند سال تک قایم رہی اور آخر کار فرانس لڑائی سے تھک گیا لیکن امیر کا عزم اُسی پہلی حالت پر تھا۔ فرانس نے پرانے قائد لشکر کی جگہ جنرل بوجیڈ کو روانہ کیا اور اُس کے ساتھ اور فوجیں بھی بھیجیں۔ لیکن یہ تمام فوج بھی اُس ثابت العزم بہادر کے سامنے نہ ٹھیر سکیں۔

جب امیر نے دیکھا کہ تمام ملک میدان حرب ہو رہا ہے تو اُس نے ایک سفری شہر بنایا جس کا نام اُس نے الزملہ رکھا۔ شکست خوردہ لوگ اپنی عورتوں اور بچوں کو لیکر وہاں پناہ لیتے تھے اور ہر قسم کے صناع اور کاریگر ساتھ رہتے تھے۔ اور ضروریات کا بھی مکمل انتظام تھا۔ فوج کے ساتھ یہ شہر بھی چلتا رہتا تھا۔ اس شہر کے خیمے ہر جگہ ایک خاص ترتیب سے نصب کئے جاتے تھے۔ ہر خیمہ کے لئے ایک مخصوص جگہ متعین تھی۔ امیر نے اپنی فوج کو حکم دیدیا تھا کہ کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے اور قیدی کو زندہ پکڑ کر لانے والے کیلئے انعام بھی تجویز کیا۔

فرانسیسیوں کو جب اس منتقل شہر اور اس کے منافع کی خبر ہوئی تو چند خائن لوگوں کے ذریعہ سے اُسکا پتہ چلا لیا۔ اور اُس پر حملہ کر کے اُسے بالکل جلا ڈالا لوگوں کو قتل کیا اور تمام سامان لوٹ لے گئے اور اس سے کچھ عرصہ پہلے امیر کے پایہ تخت تقدمہ کو بھی جلا کر خاک سیاہ کر ڈالا۔

امیر اس وقت ایک دوسرے مقام پر تھا جب اُسے الزملہ اور تقدمہ کے جل جانے کی خبر ملی تو اسکے غم اور تکدر کی کوئی حد نہ تھی۔ لیکن اُس نے مایوسی کی کوئی علامت بھی اپنے چہرہ پر نمایاں نہ ہونے دی اور اُسنے لوگوں سے کہا کہ تم اس کی کچھ پرواہ نہ کرو ہمارے وہ بھائی جو معرکوں میں شریک ہو کر مارے گئے ہیں وہ خدا کے پاس انتہائی سعادت اور نعیم ابدی میں ہیں۔ پھر امیر نے دوبارہ جنگ کی تیاریاں شروع کیں اور ایک نیا الزملہ تیار کیا۔ اس کے بعد انگلستان سے اُس نے مدد چاہی مگر انگریزوں نے اسے منظور نہیں کیا۔ سلطان مراکش نے بھی مدد دینے سے انکار کر دیا لیکن باوجود اس کے امیر کی ہمت اور عزم میں ذرا بھی ضعف نہیں آیا اور وہ بذاتِ خود پھر دشمن کی مدافعت میں مصروف ہو گیا۔

فرانس کی فوج کو برابر مدد پہونچتی جاتی تھی۔ فرانس نے اپنی حکمت عملی سے سلطان مراکش کو بھی اپنے ساتھ کر لیا۔ جب امیر کو اس کی خبر ہوئی تو وہ اس دشمن قوم سلطان کے طرز عمل سے حد درجہ برافروختہ ہوا آخر میں جب اس نے ایک متحدہ دشمن کے مقابلہ میں اپنی فوج کو بالکل ناکافی سمجھا تو اُسے اپنی کامیابی کی بالکل امید باقی نہیں رہی۔ یہاں تک کہ بعض وقت اُسے خیال آتا تھا کہ سارے ملک کو فرانسیسیوں کے ہاتھ میں چھوڑ دے اور اپنے خاص آدمیوں کو لیکر مکہ معظمہ چلا جائے اور جہاد کا علم بلند کرے۔ اتفاق سے اسی اثنا میں بعض قبائل کی طرف سے اُسے مدد پہونچی جس سے دوبارہ اس کے عزم میں کچھ قوت پیدا ہوئی اور اُس نے پھر جنگ شروع کر دی اور تمام ملک کو میدان کر دیا۔ ۱۸۴۶ء تک وہی حالت رہی یہاں تک کہ قبائل لڑتے لڑتے بالکل تھک گئے اور اُن کی ایک بڑی تعداد امیر سے علیحدہ ہو کر سلطان مراکش کے ملک میں چلی گئی۔

فرانس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور مراکشیوں کو امیر کے خلاف برانگیختہ کیا۔ مراکش کے مسلمان ایک غیر مسلم حکومت کی موافقت میں مسلمانوں سے لڑنے کے لئے نکلے اور متعدد مقامات پر معرکے ہوئے امیر بھی اپنی ممکن طاقت سے لڑ رہا تھا۔ اور دشمنوں کی کثرت اور طاقت کی اُسے کچھ پروا نہ تھی۔ البتہ سلطان مراکش کی خیانت کا اُسے بہت صدمہ تھا۔ اس نے سلطان کے پاس کچھ لوگ روانہ کئے اور اُسے اپنی قدیم دوستی یاد دلائی۔ سلطان نے یہ جواب دیا کہ یا تو تم اپنے کو ہمارے سپرد کردو یا الجیریا کے جنگلوں میں سکونت اختیار کرو۔ امیر کو اس جواب سے جس قدر صدمہ ہونا چاہئے تھا ظاہر ہے۔ اسکے بعد امیر صرف نماز اور قرآن شریف کی تلاوت کے سوا کچھ نہیں کرتا تھا۔

۱۸۴۷ء کے آخر میں اسے معلوم ہوا کہ اہل مراکش اس کے متصل شہر الرملہ کو لوٹنے آرہے ہیں۔ اسوقت الرملہ میں صرف پانچ ہزار آدمی تھے اور مراکشیوں کی تعداد پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ امیر اس حالت کو دیکھکر پہلے بہت خائف ہوا۔ لیکن آخر میں پھر اُس نے کمر ہمت باندھی اور اپنی قلیل جماعت کو لیکر مراکشیوں سے مقابلہ کیا اور اُن کے لشکر کو متفرق کردیا۔ مراکشیوں نے پھر جمع ہوکر حملہ کیا اور اس مرتبہ بھی اُنہیں شکست ہوئی لیکن امیر کا بھی بہت نقصان ہوا اور اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ اپنی فوج کو لیکر پیچھے ہٹ جائے۔ چنانچہ وہ شہر الجزائر یا دارالحکومت الجیریا کی طرف پیچھے ہٹا اور ایک ایسا موقع پر پہنچ گیا جہاں سے فرانسیسی فوج صرف بارہ میل کے فاصلہ پر تھی لیکن امیر کو اس کی خبر نہ تھی۔ جب امیر وہاں پہنچ گیا اور فرانسیسی فوج کا حال اسے معلوم ہوا تو اُسے سخت فکر ہوئی کیونکہ اس کی فوج لڑائی اور سفر سے بالکل تھک گئی تھی۔ اسے خوف ہوا کہ کہیں وہ اور اسکی فوج فرانس کے قبضہ میں نہ آجائے۔ وہ اس حالت میں واپس بھی نہ جاسکتا تھا کیونکہ پیچھے سے مراکش کی فوج تعاقب کررہی تھی امیر نے اپنے تمام آدمیوں کو جمع کیا اور ایک نہایت مؤثر تقریر کی، اثنائے تقریر میں اُس نے کہا۔

"تم لوگوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ بیشک تم نے اپنی بیعت کا پورا حق ادا کیا۔ اور تم نے میری مدد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا موجودہ حالت اس کی مقتضی ہے کہ ہم اپنے کو دشمن کے سپرد کردیں۔ میرے نزدیک بجائے فرانسیسیوں کے اگر اپنے کو مراکش کے قبضہ میں دے دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ تمہاری اس میں کیا رائے ہے؟"

سب نے اسکی رائے سے اتفاق کیا۔ امیر کے تمام رفقا نہایت بہادر، عالی ہمت اور وطن پر قربان

ہونیوالے تھے۔ پندرہ برس تک انہوں نے امیر کی رفاقت کی تھی، امیر کو یہ امر نہایت شاق تھا کہ وہ اس طرح دشمن کے ہاتھوں میں چلا جائے لیکن اُسے مجبوراً ایسا کرنا پڑا امیر کی ہمت اور عزم اور اُس کی ان تھک کوششوں کو دیکھتے ہوئے ہم ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا کیونکہ اُس نے پندرہ سال تک فرانس جیسی حکومت کا خوب مقابلہ کیا اور انتہائی مجبوری کے وقت اُسے ایسا کرنا پڑا۔ اگر مراکش کا خائن سلطان فرانس کی مدد نہ کرتا اور مراکو کے پچاس ہزار مسلمان ڈاکو اس پر حملہ آور نہ ہوتے تو فرانس کے لئے الجیریا پر قبضہ کرنا آسان نہ تھا۔

امیر نے ۲۱ دسمبر ۱۸۴۷ء کی رات کو اپنے اور اپنی فوج کے سپرد کرنے کے متعلق چند شرائط لکھنا چاہیں لیکن بارش کی شدت سے وہ نہ لکھ سکا اور اُس نے اپنے دو معتبر قاصدوں کو اپنی مہر دیکر فرانسیسی فوج کے قائد اعظم کے پاس بھیجا۔ وہ گئے اور چند شرطیں اُس کے سامنے پیش کیں جن کا مفاد یہ تھا کہ امیر اپنا ملک چھوڑنیکے لئے تیار ہے۔ لیکن اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنے خاص آدمیوں عورتوں اور بچوں کے ساتھ اسکندریہ یا بورصہ میں رہے۔ جنرل مذکور نے بلا پس و پیش یہ شرطیں منظور کیں اور اسے بہت خوشی ہوئی کہ اب فرانس کو اس امیر کی لڑائیوں سے نجات ملی۔ پیرس میں اس پر بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ کہ ایک بدوی امیر کے مقابلہ میں یورپ کی ایک بڑی طاقت پندرہ سال کے عرصہ میں غالب آسکی اور وہ بھی قوت سے نہیں بلکہ آپس میں اختلاف پیدا کرنے سے۔

۲۵ دسمبر ۱۸۴۷ء کو امیر اپنے خاص رفقا کے ساتھ جن کی تعداد ۸۰ تک پہنچتی تھی فرانس کے جنگی جہاز طولون پر گیا۔ فرانسیسی بڑی عزت اور احترام سے پیش آئے لیکن انہوں نے امیر سے کہا کہ وہ اسکندریہ یورصہ یا کسی اور عثمانی شہر میں رہنے کے بجائے فرانس میں سکونت اختیار کرے، امیر نے اس سے قطعی انکار کر دیا۔ اسی عرصہ میں فرانس کا دور استبداد ختم ہو کر جمہوریت قائم ہوئی، اور ایک طویل مراسلت کے بعد امیر کی تمام شرطیں منظور کرنیکے ساتھ ہی ایک شرط کا اور اضافہ کیا گیا اور وہ یہ تھی کہ امیر کبھی الجیریا کا قصد نہ کرے، امیر نے مارچ ۱۸۴۸ء میں ایک تحریری عہد نامہ لکھا جس میں یہ شرط بھی منظور کرلی اور جواب کا منتظر رہا لیکن جواب خلاف مراد آیا اور وہ یہ کہ جمہوریت اسے پہلے کی طرح ایک قیدی سمجھتی ہے چنانچہ امیر اور اُس کے رفقا کو جیل میں رکھا گیا۔ فرانس کی اس حرکت پر امیر کو بہت صدمہ ہوا لیکن کیا کر سکتا تھا جیل میں سوائے کتب بینی اور تصنیف و تالیف کے اس کا کچھ اور شغل نہ تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اُس کے رفقا قید میں بہت گھبراتے ہیں تو ان سے کہا کہ تم میری وجہ سے کیوں قید میں رہتے ہو۔ تمہیں تو آزاد کیا جا سکتا ہے لیکن انہوں نے ہر حالت میں امیر کے ساتھ رہنا پسند کیا اور وہ اور اس کے رفقا اکتوبر ۱۸۵۲ء تک محبس میں رہے۔

اتفاقاً ایک دفعہ پرنس نپولین سیر کرتا ہوا محبس میں بھی آنکلا جہاں امیر اور اس کے ساتھی قید تھے۔ پرنس نے امیر سے ملاقات کی اور اُنکی رہائی کا وعدہ کیا۔ چند روز بعد امیر اور اُس کے ساتھی چھوڑ دیئے گئے۔ پرنس نپولین نے امیر کو پیرس میں اپنی ملاقات کے لئے بُلایا اور نہایت اعزاز سے پیش آیا فرانسیسی اپنی کھڑکیوں اور دریچوں میں اس بڑے امیر کو دیکھنے کے لئے بیٹھے تھے جس نے ۱۵ سال تک فرانس کو جنگ میں مصروف رکھا تھا۔ امیر اپنے چار خاص رفقا کو لیکر پرنس کی ملاقات کو گیا جلسہ میں اور لوگ بھی شریک تھے امیر نے کہا کہ چونکہ فرانسیسی عوائد و مراسم سے ناواقف ہوں اس لئے اگر مجھ سے کوئی خلاف بات صادر ہو تو معاف کیا جاؤں۔ امیر نے وعدہ کیا کہ وہ اب الجیریا واپس نہ جائیگا۔ پرنس نے اس پر اُس کا شکریہ ادا کیا اور ایک عربی گھوڑا بطور ہدیہ کے امیر کو دیا۔

ایک مہینہ کے بعد فرانسیسی عناصر نے پھر شخصی حکومت کا اعادہ چاہا اور اس کے متعلق لوگوں سے رائیں لی گئیں امیر کو بھی رائے دینے والوں میں شامل کیا گیا۔ کثرت رائے سے پرنس نپولین کو بادشاہ بنایا گیا۔ نپولین کے مسند نشین ہونیکے بعد امیر پھر اس سے ملا۔ پرنس نے اس کی بڑی عزت کی اور ایک تلوار ہدیۃً اُسے دی جس پر یہ لکھا تھا:۔

"شہنشاہ نپولین ثالث کی طرف سے امیر عبدالقادر بن محی الدین کے لئے"

۱۲ر دسمبر ۱۸۵۲ء کو امیر، فرانس کو چھوڑ کر قسطنطنیہ پہونچا فرانس کے سفیر نے اس کے ورود پر ایک بڑا جلسہ کیا۔ چند روز بعد امیر بورصہ روانہ ہوا اور فرانس کی طرف سے چار ہزار پونڈ سالانہ خرچ کے لئے منظور کیا گیا۔ بورصہ کی سکونت امیر کو پسند نہ آئی اس سے وہ اجازت لیکر پھر فرانس روانہ ہوا۔ اور ایک عرصہ تک وہاں رہنے کے بعد پھر بورصہ واپس آیا اور وہاں سے چند ہفتہ رہنے کے بعد بیروت چلدیا اور پھر دمشق کا قصد کیا۔ دمشق والوں نے اُسکے خیر مقدم کے لئے بڑی طیاریاں کیں۔ آخر کار عمارہ میں جو دمشق کا ایک حصہ ہے امیر نے سکونت اختیار کی۔ اور آخر عمر تک وہیں رہا۔ یہاں وہ اپنا اکثر وقت نماز، مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف میں گذارتا تھا۔

۱۸۶۰ء میں دمشق کی مشہور بغاوت ہوئی جس میں عیسائی خوب قتل کئے گئے امیر اس قتل عام کا بہت مخالف تھا چنانچہ اس نے اپنی تمام کوششیں قتل عام کے روکنے میں صرف کیں مگر جب کامیابی نظر نہ آئی تو جہانتک ہوسکا اس نے مسیحوں کو اپنی حفاظت میں لیا اور حتی الامکان انہیں قتل سے بچایا۔

جب اسے قتل عام کی خبر ملی تو بہت افسوس کیا اور شہر کے ہر ایک مغربی کے نام حکم بھیجا کہ وہ دیہات میں

متفرق ہو جائیں اور نصاریٰ کو قتل سے بچائیں۔ مغربی لوگ شیروں کی طرح حملہ کرتے تھے اور موت کا انہیں کچھ خوف نہیں تھا۔ جن لوگوں کو وہ قتل سے بچاتے انہیں لاکر امیر کے سپرد کر دیتے تھے یہاں تک کہ امیر کے گھر میں لاتعداد مسیحی جن میں مرد، عورتیں اور بچے سب شامل تھے جمع ہو گئے سلطنتوں کے سفیر بھی منجملہ پناہ لینے والوں کے تھے۔ جب امیر کے گھر میں گنجائش نہ رہی تو اُس نے آس پاس کے مکان خالی کرا لیے۔ امیر نے پناہ گزینوں کے کھانے وغیرہ کا معقول انتظام کر دیا تھا۔ اور اس نیک کام میں دو شریف عالم محمود آفندی حمزہ اور اسعد افندی نے بھی شیخ کی بڑی حد تک مدد کی تھی۔

اس کے تیسرے دن کردیوں نے نصاریٰ کو قید کرنیکے لئے امیر کے گھر پر حملہ کیا امیر اور اُن کے آدمیوں نے حملہ آوروں کے دفع کرنے میں بڑی کوشش کی اور کردی ناکام واپس ہو گئے۔

سات روز تک یہ ہنگامہ قائم رہا اور اس عرصہ میں امیر نے ایک لمحہ کے لئے بھی آرام نہیں کیا اور برابر مظلوموں کی مدد، زخمیوں کی تیمارداری، اور یتیم بچوں، اور بیوہ عورتوں کے ساتھ ہمدردی کرنے میں مصروف رہا۔ وہ اکثر رات رات بھر جاگتا اور بندوق اُس کے ہاتھ میں ہوتی کہ مبادا کوئی غافل پاکر پناہ گزینوں پر حملہ کرے۔ جب نیند کا غلبہ ہوتا تھا تو کچھ دیر کے لئے بندوق کی نال پر سر رکھ لیتا تھا۔

۱۵ر جولائی ۱۸۶۰ء کو دمشق میں نیا گورنر آیا اور سابق معزول ہوا اور حالات میں سکون پیدا ہوا جس روز نیا حاکم دمشق میں آیا ہے اُس دن چار ہزار مسیحی امیر کی پناہ میں اور چھ ہزار قلعہ میں تھے۔ اس کے بعد فواد پاشا آئے اور تحقیقات شروع کی اور اس طرح پر قتل عام کا خاتمہ ہوا۔

تمام نصرانی امیر کے اس عظیم الشان سلوک کے احسانمند ہیں کیونکہ امیر نے ایک ایسا کام کیا جو اس کی عظمت نفس، مروت اور شرافت پر دلالت کرتا ہے۔ دول یورپ اور خاصکر سلطنت عثمانیہ کی طرف سے بہت کچھ اظہار خوشنودی کیا گیا اور سب کی طرف سے تہنیت نامے اور تمغے امیر کے پاس بھیجے گئے۔

جب یہ فتنہ پوری طرح فرو ہو گیا تو امیر نے پھر مطالعہ اور تدریس کا شغل اختیار کیا۔

۱۸۶۳ء میں اس نے شاہ فرانس سے حج کی اجازت چاہی اور اسی سلسلہ میں طائف اور مدینہ بھی گیا امیر جہاں جاتا تھا لوگ بڑی عزت اور احترام کرتے تھے۔ زیارت حرمین سے فارغ ہو کر وہ دمشق واپس ہوا اور انہی اعمال و اذکار میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ اس کی طہارت قلبی اور تقوی کی بڑی شہرت ہو گئی۔ یہاں تک کہ بعض صوفی اس کے مکاشفات کے قائل ہو گئے۔ اور اس کو محی الدین بن عربی اور شیخ عبد الغنی

نائبی کا ہم مرتبہ سمجھنے لگے۔ اعیانِ دمشق کی نظروں میں بھی اس کی بڑی قدر تھی۔ اُسنے کبھی اپنا عربی لباس نہیں چھوڑا۔ چونکہ وہ عہد و پیمان کا بڑا پابند تھا اس لئے نپولین ثالث اس کو ہمیشہ "بہادر دوست" کے نام سے یاد کرتا تھا۔

امیر کی خانگی زندگی نہایت سادہ تھی۔ ۲۶ مئی ۱۸۸۳ء میں دمشق میں امیر نے انتقال کیا۔ لوگوں کو اسکی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ اہل قلم، علماء، اور شعراء کی طرف سے صفحات جرائد و رسائل میں مرثئے شائع ہوے۔ اور تمام عالم اسلامی نے امیر کی موت پر ماتم کیا۔

نیاز

فرمودۂ غالب

یارب ز جنوں طرحِ غمے در نظرم ریز
صد بادیہ در قالبِ دیوار و درم ریز

دل را ز غمِ گریۂ بیرنگ بجوش آر
اجزاے جگر حل کن و در چشمِ ترم ریز

ہر برق کہ نظارہ گُداز است نہادش
بگداز و بہ پیمانۂ ذوقِ نظرم ریز

ہر خوں کہ عبث گرم شود در دلم افگن
ہر برق کہ بیصرفہ جہد بر اثرم ریز

ہر جا نمِ آبیست بہ مژگانِ ترم بخش
از قلزم و جیحون کفِ خاکے بسرم ریز

ایں سوزِ طبیعی نگدازد نفسم را
صد شعلہ بیفشار و بہ مغزِ شررم ریز

مسکیں، خبر از لذتِ آزار ندارد
خارم کن و در رہ گذرِ چارہ گرم ریز

دارم سرِ ہم طرحیٔ غالب چہ جنونست
یارب ز جنوں طرحِ غمے در نظرم ریز

حکومت اسپین نے مشہور قصر حمرا کی مرمت کا حکم دے دیا ہے۔

اُندلس کی شہزادی

(۱)

حسن جس کی عمر ابھی ۲۵ سال سے متجاوز نہ ہوئی تھی، ایک دراز قامت، سنجیدہ صورت اور مردانہ حُسن کی تمام خصوصیات رکھنے والا خوش وضع نوجوان تھا۔ اکتسابات باطن کے لحاظ سے بھی وہ نہایت حسین و دلکش صفات کا مالک تھا، بے مثل ادیب، خوشگو شاعر، فنون لطیفہ کا بہترین ماہر؛ وہ جنس لطیف پر اس سے زیادہ اور کیا ظلم کر سکتا تھا؟

اُندلس کے مشہور شہر غرناطہ میں دریائے ویگا کے ساحل پر وہ ایک خوبصورت قصر کا مالک تھا، جسکا ہر حصہ بیش بہا مصری قالینوں اور مشرقی نادرات سے آراستہ تھا۔ مکان کے گوشہ میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا، جہاں مختلف علوم و فنون کی کتابیں مہیا تھیں؛ اور یہ اس کا کتب خانہ تھا۔

حسن کا زیادہ وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا یا اس کے بعد سیر و تفریح میں۔ چونکہ وہ روسائے شہر میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا تھا اس لئے شہر کا ہر چھوٹا بڑا آدمی اس سے واقف تھا، اور غرناطہ کا کوئی رئیس ایسا نہ تھا جو حسن کی عزت و وقعت نہ کرتا ہو۔

اس وقت جبکہ اُندلس میں اسلامی شان کی عظمت و رفعت عیسائیوں کے جبر و استبداد سے پامال ہو چکی تھیں، اسلامی رعایا کا قتل عام کیا جا رہا تھا۔ آفتاب توحید کو عین نصف النہار کے وقت گہن لگ چکا تھا۔ عام شرفاء و امراء عیسائی فوجوں سے خائف و بدحواس ہو کر شہروں کو چھوڑ رہے تھے؛ اور سرزمین اُندلس کا چپہ چپہ آگ اور خون کے چھینٹوں سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ جب عیسائیوں نے تمام اُندلس پر قبضہ کر کے امن و امان قائم کر لیا تو لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہو گئے، تاہم تسلط کے بعد عیسائی افسروں کا برتاؤ عموماً اہل غرناطہ اور خصوصاً شاہی خاندان کے ساتھ سخت تعصب آمیز رہا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے جو چند نفوس قتل و غارت سے بچ رہے ہیں غرناطہ کی سرزمین پر ایک گوشۂ عافیت بھی انہیں دیا جائے۔ چنانچہ اکثر عیسائی افسروں نے تو شاہی خاندان کی نازنینان حرم کی بھی بےحرمتی کا ارادہ کر لیا۔ سنجیدہ و متین حسن نے، جو زمانہ کے نشیب و فراز دیکھ رہا تھا؛ ہر چند کہ اس کا دل قوم کی دردناک

حالت سے متاثر تھا لیکن اپنا عظمت و وقار قایم رکھنے کے لئے بظاہر عیسائیوں کا طرف دار بن گیا تھا)۔ عیسائی حکومت کی طرز معاشرت یہاں تک اختیار کی کہ عیسائی اُسے اپنا سچا معاون سمجھنے لگے ؛ اور اُس کا رسوخ وزیر دربار تک ہوگیا ؛ اور وزیر اکثر اوقات اہل غرناطہ کے متعلق اس کے مشورہ پر کام کرنے لگا۔ یہ سب کچھ تھا لیکن حسن کی روح اس وقت کانپ جاتی تھی ، جب وہ محسوس کرتا تھا کہ اُس نے محض اپنی اور اپنے حرم کی عزت بچانے کے لئے قوم سے غداری کی ہے۔

(۲)

شہر غرناطہ میں قصر الحمرا، (جسے عرب قلعتہ الحمرا بھی کہتے ہیں) ، عربی طرز تعمیر کا بہترین نمونہ تھا ؛ اور یہ قصر شہر کے کنارے ایک بلندی پر واقع تھا۔ اس کی صنعت حیرت انگیز تھی ، سنگ مرمر کی دیواروں میں گل کاریاں اور محرابوں کے نقش و نگار ، سیاحوں کو محو حیرت بنا دینے کیلئے کافی تھے۔ طاقوں پر گل بوٹے اور قلم کاریاں ، ستونوں پر عقیق و زبرجد کی سلیں ، دیکھنے والوں کے دل میں عجیب انشراح پیدا کردیتی تھیں۔

قصر الحمرا کا بیت الکبر جواسی کا ایک حصہ تھا خصوصیت کے ساتھ بے انتہا حسین تھا۔ چھت کی آرائش سنہرے بیل ، بوٹوں سے کی گئی تھی ؛ اس کا دروازہ صندل و آبنوس کی لکڑی سے بنا تھا اور اُس پر سبز ریشمی چلمنیں پڑی رہتی تھیں۔ اس کا فرش رنگین مخملوں سے سجا رہتا تھا ، جس میں ہر وقت دوشیزگانِ حرم ، شہزادی حبیبہ کے عیش و طرب کا سامان کیا کرتی تھیں۔

حبیبہ جو الحمرا کی بزم شاہی میں ایک روشن شمع تھی ، جس پر کنیزیں پروانوں کی طرح نثار ہوا کرتی تھیں ، جس کے باصرہ نواز جمال سے نور کی شعاعیں نکل کر غرناطہ کے گوشہ گوشہ میں پھیل چکی تھیں ، ایک نے لف صد کمند تھی ، اور اس کا شباب و حسن ، جوانانِ غرناطہ کیلئے ایک بے پناہ تباہی و بربادی۔

حبیبہ۔ جس نے اپنے حجلۂ ناز سے نکل کر کبھی کسی غیر محرم کو نہ دیکھا تھا ، ایک صبح اپنے قصر کے دریچہ میں کھڑی ہوکر پائیں باغ کے نظارہ میں محو تھی ، ایسی محو کہ اس کی تمام قوت بصر یک جا جمع ہوکر ایک رنگین شاداب پھول کے نظارہ میں صرف ہورہی تھی۔ سادہ عربی وضع کا لباس زیب تن تھا اور اس کی گھنی سیاہ زلفوں میں گلابی رخسار ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے موسم باراں کے سیاہ بادلوں کے ٹکڑوں میں علی الصباح آفتاب طلوع ہوتا ہے ، یا جس طرح تاریکی میں بجلی چمک چمک جاتی ہے۔

وہ اسی تفریح میں مصروف تھی کہ پائیں باغ کے مغربی راستہ سے ایک عیسائی سوار گذرا اور اُسے

دیکھنے لگا۔ حبیبہ جھجک کر فوراً اندر ہوگئی اور غصہ سے بیتاب۔ اس کی حالت یکسر التہاب و اضطراب تھی، اپنے ملک و خاندان کی عظمت و شان کی تباہی و بربادی پر روتی، عیسائیوں کے ظلم و عدوان کے خیال سے اپنے نازک لبوں کو دانتوں میں دبالیتی، کبھی مایوس ہو کر پشت دست پر اپنا رنگین رخسار رکھ کر سوچنے لگتی اور کبھی غیرت و شرافت کے جذبات سے بیتاب ہو جاتی تھی۔

اس کی وہ کنیزیں جو ہر وقت اُس کے پاس رہتی تھیں اور جو اپنے عربی نغموں سے اُس کے لئے ایک گونہ دلچسپی کا سامان پیدا کیا کرتی تھیں ہر چند اس وقت بھی حبیبہ کی دلدہی کے لئے آمادہ تھیں، لیکن وہ ہجوم گریہ سے بیتاب تھی اور کوئی تفریح اس کے غم و الم میں کمی پیدا نہ کرسکتی تھی، اس نے اپنی کنیزوں کو مخاطب کرکے کہا "تم جانتی ہو کہ ہماری حکومت کے انقلاب سے جو حوادث پیش آرہے ہیں وہ کیا کیا ہیں؟ ظالم و جابر عیسائیوں نے جس بیدردی سے ہماری توہین کی ہے وہ ذلت کی نہایت پُر درد داستان ہے، اور میں دیکھتی ہوں کہ میرا مستقبل بھی نہایت تاریک ہے۔ آج جس عیسائی سوار نے دریچہ سے جھانکتے ہوئے مجھے دیکھا ہے اس کی نگاہیں آگ کی طرح میرے بدن میں سرایت کر گئی ہیں۔ لیکن میں بالکل مجبور ہوں اور اس کی بدنظری کا کوئی انتقام نہیں لے سکتی۔ افسوس ہے کہ قدرت نے میرے باپ سے وہ طاقت چھین لی، کل، جس کا وہ تنہا مالک تھا۔

صفیہ! تم میرے باپ سے کہو کہ یہاں سے ہجرت کرکے خلیفہ بغداد کی خدمت میں چلیں، میں خود یہاں کے قتل و غارت کی دردناک داستان سُنا کر اُسے اندلس پر حملہ کرنے کے لئے مستعد کروں گی۔ میں اب یہاں کسی حال میں قیام کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔"

صفیہ نے جو خود بھی ایسا چاہتی تھی، حبیبہ کی یہ تجویز نہایت پسند کی اور راتوں رات سفر کے سارے اسباب مہیا کر لئے گئے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ تجویز قرار پائی کہ پہلے شہزادی حبیبہ کا محمل مع ایک خادمہ کے شہر پناہ کے باہر بھیج دیا جائے۔

(۳)

دوسرے دن کا آفتاب ہنوز بلند نہ ہوا تھا کہ وزیر سے محافظ دستہ کے ایک سپاہی نے اطلاع کی کہ "ایک محمل شہر سے جا رہا تھا جسے میں نے فرمان کے بموجب روک لیا ہے۔"

محمل اندر لایا گیا اور وزیر نے شتربان سے کہا "اس میں کون ہے؟" شتربان سہم کر بولا "اس میں

ہماری شہزادی ہے۔" وزیر نے نہایت کرخت آواز میں کہا "نہیں، نہیں، اس میں کوئی شہزادی نہیں ہے بلکہ تمہارے خفیہ محکمہ کا کوئی آدمی ہے۔ تم لوگ باوجود ہمارے سخت احکام کے ابھی تک اپنی ان بیہودہ سازشوں سے باز نہیں آئے۔ اس محمل کا پردہ اُٹھاؤ، ہم دیکھیں یہ کوئی مرد ہے یا عورت۔"

شتربان خاموش کھڑا تھا اور اس جابرانہ حکم کو سنکر کانپنے لگا، اور جب دوبارہ حکم دیا گیا، تو ایک عیسائی دربان نے جرأت کی کہ آگے بڑھکر محمل کا پردہ اُلٹ دے، لیکن خادمہ جو حبیبہ کے ہمراہ اندر بیٹھی تھی فوراً باہر نکل آئی: اور دردناک لہجہ میں کانپتی ہوئی آواز سے کہنے لگی "اے وزیر کیا ابھی تیرا ظلم ختم نہیں ہوا؟" اگرچہ اس خادمہ کی بیباکی پر وزیر دربار ایک لمحہ کے لئے خاموش ہوگیا، لیکن اس کا سیلاب تم دوبارہ جوش میں آیا اور کہنے لگا "ابھی اس میں کوئی اور بھی ہے۔" خادمہ نے کہا "ہاں، ہے، بیشک ہے! اور وہ وہی شہزادی ہے، جس کے باپ کے تخت وتاج کو تو نے تاراج کیا ہے، اور جس کی بے حرمتی پر اے شیطان تو اس وقت بھی آمادہ ہے!"

حسن وزیر دربار سے اکثر ملنے آیا کرتا تھا اور اس وقت بھی وزیر کے پاس چند منٹ پہلے سے بیٹھا ہوا تھا وہ خاموشی کے ساتھ یہ تماشا دیکھ رہا تھا، لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ وزیر کی ان غیر شریفانہ حرکتوں سے بے تاب ہوا جا رہا ہے، اس کے دوران خون میں ایک تلاطم برپا ہے۔ عیسائی وزیر کے مکرر حکم پر کہ "پردہ اٹھا دیا جائے" مؤدبانہ کھڑا ہو کر عرض کرنے لگا کہ "جانے دیجئے، اور ان کے حال سے تعرض نہ کیا لیکن چونکہ حسن کے یہ الفاظ حالت غضب میں نکلے تھے، اس لئے وزیر سمجھ گیا اور بولا "ہاں، اے حسن میں سمجھ گیا ہوں کہ اس وقت تو بھی میری مخالفت پر آمادہ ہے۔ اچھا، میں حکم دیتا ہوں کہ تو باہر چلا جا۔"

حسن، جو اس وقت سر تا پا پیکر جلال بنا ہوا تھا، وزیر کے اس حکم پر کہنے لگا کہ "اے مردود کیا تو سمجھتا ہے کہ تیری یہ سطوت وہیبت مجھے مرعوب کرلیگی، اور کیا میں تیرے اس ذلیل حکم کی تعمیل کرونگا، خصوصاً ایسی حالت میں، جبکہ ہماری نازپروردہ شہزادی کا محمل تیرے سامنے موجود ہے۔ میں اکثر یہ دیکھ کر خون کے گھونٹ پیتا رہا ہوں کہ تو نے ہمیشہ مسلمان خواتین حرم کی عصمت دری کی ہے، لیکن کیا تجھے توقع ہے کہ حسن آج بھی بزدلی و نامردی کا ثبوت دیگا؟ میں جانتا ہوں کہ فریب دینے والی دنیا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے کہ وہ بلند کو پست کرے اور پست کو بلند، لیکن کیا تو اس سے بچ سکتا ہے؟ میں نے محض اپنی عزت بچانے کے لئے، اپنی قوم سے غداری کرکے، تجھ سے دوستی کی، اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ آج تو مجھے بھی ذلیل کرکے دربار سے نکال دینے کا حکم دیگا تو میں جانوروں سے دوستی کرتا، لیکن تجھ جیسے بد اطوار کی صورت نہ دیکھتا۔ جانور اپنی جنس کا احترام کرتے ہیں۔ شیر اپنی جنس پر

پر کبھی حملہ نہیں کرتا، ایک سانپ دوسرے سانپ کو کبھی نہیں ڈستا، لیکن، آہ، طمع وحرص کے انسانی دیو نے ہمیشہ اپنی ہی جنس کو تباہ کیا ہے!"

وزیر اپنی یہ تحقیر وتذلیل دیکھ کر نیام سے تلوار کھینچکر بولا "حسن، کیا تو اپنی بدزبانی سے باز نہ آئے گا؟ تجھے معلوم ہے کہ میں کون ہوں، اور تو کس سے بدزبانی کر رہا ہے؟"

حسن:- "او کتے ہوش میں آ، اور میری نگاہوں کے سامنے سے دور ہوجا! ورنہ ابھی تیرا سر خاک وخون میں نظر آئے گا۔

وزیر دربار کا چہرہ اس وقت غصہ سے سُرخ تھا، اس کے منہ سے کف جاری تھے، اور اس کے تنفس سے سمیت پیدا ہورہی تھی، وہ چاہتا تھا کہ حسن کا سر اُڑا دے، مگر یکایک محمل کا پردہ اُٹھا اور شہزادی حبیبہ نقاب اُلٹ کر باہر نکل آئی، جسے دیکھکر عیسائی وزیر اور حسن ششدر رہ گئے۔ ایک خاموشی تھی جو چند لمحات کے لئے سب پر طاری ہوگئی، ایک سکون تھا، جس نے طرفین کی حرکت اشتعال کو زائل کر دیا۔ اور ایک بجلی تھی جو کڑک کر دونوں کے متحرک بازوؤں پر گری اور اس طرح گری، جس نے دونوں کی نظروں کو خیرہ کر دیا۔

شہزادی۔ وزیر دربار کو مخاطب کرکے بولی "اے ناپاک روح، دیکھ میں کون ہوں، مرد یا عورت؟ اے فریب کے پتلے، میں جانتی ہوں کہ تو نے مجھے اس دریچہ میں سے جھانکتے ہوئے دیکھا تھا، جبکہ میں تیرے ظلم و تعدی کے خوف سے، ایک عرصہ کے بعد، اپنے پائیں باغ کے پھولوں کا نظارہ کر رہی تھی۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ اس وقت میں تیرے قبضہ میں ہوں؟ اگر تیرا یہ خیال ہے تو اس سے پہلے یہ سمجھ لے کہ اس وقت میری روح ہمیشہ سے زیادہ آزاد ہے۔"

حسن پر ایک گھری مگر تیز، تیز لیکن محبت پاش نظر ڈال کر عیسائی وزیر سے بولی۔

"کیا تو نہیں جانتا کہ ہماری رگوں میں عرب کا شریف خون موجزن ہے، بچپن سے ہمارا کھیل تلواروں کے ساتھ رہا ہے، شہسواری وغیرہ بازی ہمارا مذہب ہے، تاریخ میں دشمنوں کے سر ہماری چمکتی ہوئی تلواروں کے شاہد ہیں، او بداندیش، او باطل پرست عفریت، او مکر وفریب کے پتلے، اگرچہ تیرے ہاتھ اس وقت ہمارے خون سے دھلے ہوئے نظر آرہے ہیں، تیری روح تعصب کے عمق میں ڈوبی ہوئی ہے، لیکن کیا تو سمجھتا ہے کہ اس وقت ہمارا کوئی مددگار نہیں ہے، اور کیا تیرا خوف میرے لبوں پر مہر لگا سکتا ہے؟ اے ناپاک عیسائی، میں وہ ہوں، جس کی محلسرا میں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا، جس کا جسم آفتاب نے بھی کبھی کھلا ہوا نہیں دیکھا،

لیکن آج میں خون آلودہ نگاہوں کے ساتھ تیرے سامنے کھڑی ہوں - اگر میں نے اس مصیبت سے نجات پائی تو غلاموں کی طرح تیرا سر نیچا کر کے دکھا دونگی - اگر مجھ میں جذبۂ حریت و شرافت موجود ہے تو اس کا انتقام تجھ سے لونگی، اور ضرور لونگی۔"

حبیبہ کی یہ گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ وہی خادمہ، جسے ابھی باہر نکال دیا گیا تھا، مع اپنے چند ہمراہیوں کے وزیر کے مکان پر آموجود ہوئی، اور سب نے جوش غضب میں آکر اسقدر شور و غل کیا کہ وزیر گھبرا گیا، اور اسنے اپنی بدنامی و خوف کی وجہ سے حکم دیا کہ اس محمل کو جلد باہر بھیجدیا جائے - چنانچہ حسن بحفاظت شہزادی کو مع اُسکے محمل کے باہر لایا اور جو لوگ دروازہ پر کھڑے شور کر رہے تھے انہیں ساری کیفیت سنا کر انکی تسلی کی، اور شہزادی کو اُنکے سپرد کر دیا۔

تاراج شدہ تخت و تاج کا مالک خاندان، حسن کی اس ہمدردی کا اگرچہ بے انتہا شکر گذار تھا اور اپنی موجودہ تباہ حالی و بربادی میں اس بار احسان کو اٹھا سکنے کی برداشت نہ رکھتا تھا، تاہم اس نے اس احسان عظیم کے تدارک کی جو تجویز سوچی، وہ یہ تھی کہ حبیبہ کی شادی حسن سے کر دی جائے۔

حسن ابھی اپنے گھر نہ پہونچنے پایا تھا کہ اس کی گرفتاری کا حکم جاری ہو گیا اور اسی روز وہ گرفتار کر کے جیل بھیجدیا گیا۔

شہزادی حبیبہ، اس خبر سے کہ حسن کو محض میری وجہ سے جیل جانا پڑا، بیتاب ہو گئی - اس کے اضطراب و التہاب میں ایک شعلہ، شعلۂ آتش نہیں - بلکہ آتش خاموش کا ایک نامعلوم شعلہ بھڑک اُٹھا - اس کی روح پر ایک صدمہ تھا، ایسا صدمہ جو اس سے قبل اس نے کبھی نہ دیکھا تھا، کیونکہ حسن سے اب اُسے محبت ہو گئی تھی۔

وہ ناز پروردہ حبیبہ، جسے آلام و مصائب کے ہاتھ کبھی نہ چھو سکے تھے، وہ نازک فطرت جسے حسرت و الم نے کبھی مس نہ کیا تھا، آج رات کی تاریکی میں بے خواب تھی۔

حسن، مصیبت زدہ حسن، قید میں تھا اور ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں محبوس - لیکن اس کا دماغ محبت کا حامل تھا، اس کی آنکھوں کی باریک رگوں میں بادۂ خون موج زن تھا، اس کی روح پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی، اور اس کا دل فخر و غرور سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا تھا، اس خیال سے کہ حبیبہ کی محبت، اِس قید تنہائی میں بھی اس کی مونس ہے۔

امام

باقی

مجرم

علوم جدیدہ کی نظر میں

اگر کسی بچہ کو جس کی عمر چھ سال سے زائد نہیں ہے، قید بامشقت یا سزائے موت کا حکم سُنایا جائے، تو ہر شخص اس سزا کو وحشیانہ حکم خیال کرے گا، کیونکہ اس عمر کا لڑکا ضعفِ ادراک اور قصورِ عقل کی وجہ سے، صحیح و فاسد، نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اور اگر اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی شامل کر لیا جائے کہ مجرموں کا بھی اکثر حصہ عقل و تمیز، احساس و ادراک کے لحاظ سے اک کمسن لڑکے سے زیادہ نہیں ہوتا (جیسا کہ گذشتہ چند سالوں کے اندر دماغی امتحانات کی بنا پر ثابت ہو گیا ہے) تو پھر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا کہ کیوں انہیں قید خانوں میں بند کیا جاتا ہے، جہاں بجائے اصلاح کے اُن کی طینت اور خراب ہو جاتی ہے اور کیوں نہیں ان کی دماغی اور اخلاقی حالت درست کی جاتی ہے، تاکہ اُن کا احساس و ادراک ترقی کرے، قوتِ ممیزہ پیدا کر دے؟

زمانہ قدیم میں سزا کے طریقے: ہیئتِ اجتماعیہ (سوسائٹی) نے مرورِ زمانہ اور رفتارِ تمدن کے ساتھ ساتھ مجرموں کی سزائیں بھی مختلف طریقے اختیار کئے ہیں جن کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے جس قدر ترقی تمدن میں کی ہے اسی قدر جرائم کی سزا میں تخفیف کرتا چلا آیا ہے۔ ایک مشہور قانون داں کا قول ہے کہ "سزا کی تاریخ ایک متواتر تخفیفِ سزا سے عبارت ہے۔"

قدیم زمانہ کے لوگ جو سزا مجرموں کو دیتے تھے اگر اس کا آج کل کی متمدن دنیا کی سزاؤں سے مقابلہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ لیکن باوجود اس کے زمانۂ حال کے مصلحین، قانون سزا کے متعلق ایک جدید دور کے منتظر ہیں، جس میں مجرم کو تکلیف پہونچانے کے بجائے زیادہ تر اس کی دماغی اور اخلاقی حالت کی اصلاح پیشِ نظر ہو گی اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور چنداں بعید نہیں ہے۔

دنیا نے سزاؤں میں جو کچھ تبدیلیاں کی ہیں انہیں ہم اختصار کے ساتھ ذیل میں بیان کرتے ہیں اور اس کے متعلق کسی خاص قوم کا ذکر نہیں کرتے کیونکہ تمام قوموں میں یہ تبدیلیاں یکساں طور پر ہوئی ہیں۔

سزا عہدِ قدیم اور عہدِ جدید میں

انتقامِ شخصی ازمنۂ قدیمہ میں سزا کی بنا محض طلبِ انتقام پر تھی، کیونکہ اس زمانہ میں کوئی ایسی حکومت نہ تھی، جو افراد کے باہمی اختلافات اور ظلم و تعدی کو مٹاتی۔ ہر شخص (یا اس کا خاندان) مجاز تھا کہ وہ اپنے حق کو دشمن سے حاصل کرے اور اس سے اپنا انتقام لے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کس قدر مظالم ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ صرف طاقتور افراد ہی دشمن سے اپنا حق اور انتقام لے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سزا کی کوئی حد نہ تھی بلکہ بسا اوقات، سزا حد سے گذر کر بجائے خود ایک سنگین جرم ہو جاتی تھی۔

جب دنیا میں حکومت کی عمومی قوت پیدا ہوئی تو منجملہ اور انتظامات کے سزا میں بھی تحدید ہونے لگی، جیسا کہ اس قول ماثورہ سے ظاہرہ ہے :-

ان النفس بالنفس و العین بالعین	بیشک نفس کے بدلے نفس، آنکھ کے بدلے آنکھ
و الانف بالانف و الاذن بالاذن	ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان
و السن بالسن و الجروح قصاص	دانت کے بدلے دانت ہے اور زخموں کا بھی بدلہ ہے

سزا کی دوسری صورت یہ بھی قرار پائی تھی کہ جسمانی ایذا کا معاوضہ مال سے ادا کیا جانے لگا، قدماء نے اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ اس معاوضہ سے بحث کی ہے۔

انتقامِ قومی جب حکومت کی طاقت اور اس کا نفوذ بڑھا تو افراد سے حقِ انتقام چھین کر حکومت نے اپنے قبضہ میں لے لیا اور رعایا کے درمیان اس کے ذریعہ سے امن قایم کیا۔ اب سزا نے ایک دوسری صورت اختیار کی یعنی اس میں انتقامِ شخصی کے علاوہ انتظامِ قومی کی حیثیت بھی پیدا ہوگئی۔ اجتماعی ترقی کے اس دوسرے دور میں سزا میں تخفیف اور ترہیب کا پہلو بھی شامل ہوگیا اور اب سزا کی بنا دو چیزوں پر ہوگئی۔ "انتقامِ قومی اور ترہیب۔"

اٹھارھویں صدی کے آخر میں فلاسفۂ یورپ نے جو خیالات اس مسئلہ میں ظاہر کئے ہیں، ان کی وجہ سے علمائے قانون کے خیالات میں بہت کچھ انقلاب پیدا ہوگیا ہے۔ اور سزا کے مختلف نظریہ قایم کئے گئے ہیں، جن میں سے یہ مشہور ہیں :-

۱- اتفاق اجتماعی اس نظریہ کا واضع اول روسو ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگ زمانہ اجتماع سے پہلے انفرادی حالت میں رہتے تھے، بعد میں لوگوں نے اتفاق کر کے ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی) کو قائم کیا اور اپنے حقوق کی حفاظت اور مجرمین کی سزا جو پہلے افراد کے ذمہ تھی ہیئت اجتماعی کے سپرد کی تاکہ باہمی قرارداد کی مخالفت کرنے والے پر جو حکم سوسائٹی کی طرف سے نافذ ہو اس کی تعمیل واجب قرار دی جائے۔

یہ نظریہ بالکل غلط ہے کیونکہ حیات انسانی ہمیشہ سے نظام اجتماعی کے ماتحت چلی آئی ہے اور کسی زمانہ میں بھی انسان اپنے ابنائے جنس سے علیحدہ ہو کر انفرادی حالت میں نہیں رہا ہے۔ لہذا روسو کا یہ کہنا کہ انسان پہلے انفرادی زندگی بسر کرتا تھا اور بعد میں اس نے اتفاق کر کے ہیئت اجتماعیہ کو قائم کیا، تخیل محض سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

۲- فائدہ عامہ اس نظریہ کا قائل ایک انگریز بنتھام ہے۔ اس نے سزا کی بنیاد محض فائدہ عامہ پر رکھی ہے یعنی قوت عامہ یا حکومت، صرف عام مفاد کی غرض سے مجرموں کو سزا دیتی ہے اور مجرم حقیقت میں ہیئت اجتماعی کے دشمن ہیں۔

اس نظریہ کا تقاضا یہ ہے کہ سزا اسی نسبت سے ہو جتنا کہ سوسائٹی کو ارتکاب جرم سے نقصان پہونچا ہے حقیقتاً یہ نظریہ سزا کے متعلق تخویف و ترہیب کے قدیم اصول کا اعادہ کرتا ہے اور اس نظریہ کی بنا پر متعدد قوانین بنائے گئے ہیں۔ فرانس کا قانون جرائم جو نپولین کے عہد میں (۱۸۱۰ء) وضع ہوا تھا، اس میں اس نظریہ کی خاص رعایت رکھی گئی تھی۔

۳- عدل مطلق یہ نظریہ ماسبق کی بالکل نقیض ہے۔ اس نظریہ کی رو سے مجرم کو اس لئے سزا نہیں دی جاتی کہ وہ ہیئت اجتماعی پر خراب اثر ڈالتا ہے، بلکہ اس میں نفس جرم کا لحاظ ہوتا ہے۔ جس قدر جرم سنگین ہو اور آداب صحیحہ اور انصاف حقیقی کے مخالف ہو اسی نسبت سے مجرم کو سزا ملتی ہے۔ اس نظریہ کا قدیم ترین قائل افلاطون ہے، اور جرمن فیلسوف کنٹ کا بھی یہی مذہب ہے لیکن یہ قول بھی ضعیف ہے کیونکہ اگر اسے صحیح مانا جائے تو قوانین اخلاق (جن کا مرتبہ نہایت بلند ہے) اور انسان کے قوانین موضوعہ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ بہت سے جرم ایسے ہیں جو اخلاق کے خلاف ہیں لیکن ہیئت اجتماعی کو اُن سے کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔

۴- نظریہ متوسط اس نے دونوں اگلے نظریہ کو جمع کر دیا ہے۔ اس کے قائل فرانس کے فلسفی کوزن اور جیزو ہیں یہ کہتے ہیں کہ ہیئت اجتماعیہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی مجرم کو حد انصاف سے زیادہ سزا دے، یا سزا کی اس حد سے تجاوز کرے جس سے مقصود حاصل ہو سکتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ۱۸۳۲ء میں

فرانس کے قانون جرائم میں بہت کچھ ترمیم و تعدیل ہوئی ہے۔ مگر اس نظریہ پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں مجرم کی نیت وکردار کا لحاظ ہے جس سے سزا میں بہت کچھ تخفیف ہو جاتی ہے۔

عہد حاضر کے اقوال

علم الحیات کا اثر علمائے علم الحیات کے نزدیک، ہئیت اجتماعی ایک زندہ جسم سے مشابہ ہے، اس لئے وہ بھی زندہ جسم کی طرح قانون "حفاظتِ بقا" کے تابع ہے، لہذا سزا کے ذریعہ سے سوسائٹی اُن خطرات کو دفع کردیتی ہے، جو اس کی بقا کے راستہ میں حائل ہوتے ہیں۔ اگر کسی مجرم کو سزا دی جاتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سوسائٹی اپنی ذات اور اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرتی ہے۔ حقیقت میں یہ خیال بھی مذہب "تخویف و ترہیب" کا اعادہ ہے۔

علم جرائم انسانی ابتدا میں اس علم نے یورپ کی قانونی دنیا میں بڑی ہل چل مچادی تھی، لیکن جب لوگوں پر اس کے اصول کی کمزوری اور قواعد کا ضعف معلوم ہوا تو اس کی طرف توجہ کم ہو گئی۔

اس علم کے مدعی (جس کا پیش رو لومبروزو، اطالوی ہے) کہتے ہیں کہ مجرموں کی جسمانی حالت عام انسانوں کی طرح فطرت کے مطابق نہیں ہوتی، بلکہ اُن کی جسمانی ساخت میں کچھ ایسے غیر طبعی امتیازات اور خصوصیات ہوتے ہیں جو انہیں، لامحالہ، ارتکاب جرائم پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً لومبروزو کہتا ہے کہ ایک چور کے ہاتھ لمبے اور قاتل کے چھوٹے ہوتے ہیں، اس طرح اُس نے مجرموں کی اور بہت سی جسمانی خصوصیات بیان کی ہیں لیکن اگر یہ رائے صحیح مانی جائے تو انسانی ارادہ کوئی چیز نہیں رہتا اور نہ مجرم اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے، نیز جو خصوصیاتِ اعضاء اور علاماتِ جسمانی، لومبروزو اور اس کے متبعین نے بیان کی ہیں، وہ غلط ہیں اور اُن پر عام مجرموں کی حالت کا قیاس نہیں کیا جاتا۔

علم جرائم اجتماعی علمائے اجتماعیین کی ایک جماعت خیال کرتی ہے کہ جرائم کا سبب اولین، وہ ماحول ہے جس میں انسان تربیت پاتا ہے اور جرم نتیجہ ہے تربیتِ فاسدہ، غربت، قمار بازی اور شراب نوشی وغیرہ کا لیکن یہ کلیہ بھی اگر بالکل صحیح مان لیا جائے تو مجرم سے ذمہ داری کا بار بالکل اُٹھ جاتا ہے۔

نتیجہ اب دیکھنا چاہیئے کہ ان مختلف خیالات اور متناقض اقوال سے ہم کیا اخذ کر سکتے ہیں بیشک ہر ایک

مذہب میں ایک پہلو صحت کا بھی ہے، مثلاً اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نسل اور صحت جسمانی کو تکوین عقلی میں بڑا دخل ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ انسان پر اُس کے ماحول اور امراض اجتماعی مؤثر نہیں ہوتے۔ اس لئے آج اگر ہم جرائم کو روکنا چاہتے ہیں تو چاہئے کہ پہلے نسل کی اصلاح کریں اور پھر ماحول کی۔

جس طرح کہ طب جدید کا اصل الاصول یہ ہے کہ علاج سے زیادہ حفظ صحت کی طرف توجہ کرنی چاہئے، اسی طرح آجکل کے ماہرین قانون، بمقابلہ سزا کے اُن اسباب کے دفع کرنے میں زیادہ کوشش کرتے ہیں، جو جرموں کی افزائش اور ارتکاب جرائم کے موجب ہیں، مگر پھر بھی متمدن دنیا ابھی اس میدان میں نوآموز ہے اور راہِ عمل میں اُسے بہت سے موانع دفع کر کے اس مقصد کو حاصل کرنیکے لئے ایک کامیاب راستہ اختیار کرنا ہے، لہذا ہمیں بھی سوچنا چاہئے کہ اس کیلئے کونسا طریقہ زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں مناسب یہ ہے کہ ہر ایک مجرم کو اس کی حالت دماغی اور استعدادِ عقلی کے مطابق سزا دینی چاہئے۔ کیونکہ ایسے دو مجرم بہت کم ملیں گے، جن میں وہ اسباب یکساں طریقہ پر پائے جائیں، جو ارتکاب جرم کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لئے عدالتوں کو چاہئے، کہ سزا دینے سے پہلے مجرم کی حالت پر اور ان اسباب و ماحول پر غور کریں، جن کے ماتحت اس کی پرورش ہوئی ہے اور حسب ذیل اصولی مقاصد کو کبھی نظر انداز نہ کریں۔

(۱) مجرم کے اثرات سے ہیئت اجتماعی کو بچانا۔

(۲) سزا کا دوسروں کے لئے بھی باعث عبرت ہونا۔

(۳) مجرم کے مستقبل کو اس کے ماضی سے زیادہ شاندار بنانا۔ اور اس کی اخلاقی اصلاح کو سزا پر مقدم رکھنا۔

ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ وہ وسائل بیان کرتے ہیں، جن کے ذریعہ سے دنیا کو جرائم کے زہر آلود اثرات سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ان وسائل کا انحصار دو چیزوں پر ہے حفاظت اور علاج۔

حفاظت

۱۔ اصلاح نسل: وبائی امراض اور ہر قسم کے زہریلے اثرات خاصکر مسکرات سے محترز رہ کر نسل کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ نسل کی اخلاقی حالت کو خراب کرنے میں مسکرات کو بڑی حد تک دخل ہے۔ اس کی کثرت سے نظامِ عصبی میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے اور ذرا سی تحریک سے ہیجان عصبی پیدا ہو کر، ارتکاب جرم کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ نظریہ کہ صفات انسانی کا انتقال بطریق وراثت ہوتا ہے مجرموں کی نسل دیکھنے

سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ ہم مزید وضاحت کے لئے ذیل میں ایک نقشہ دیتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ ضعف عقلی کس طرح اور کس نسبت سے والدین سے اولاد کی طرف منتقل ہوتا ہے۔(۱)

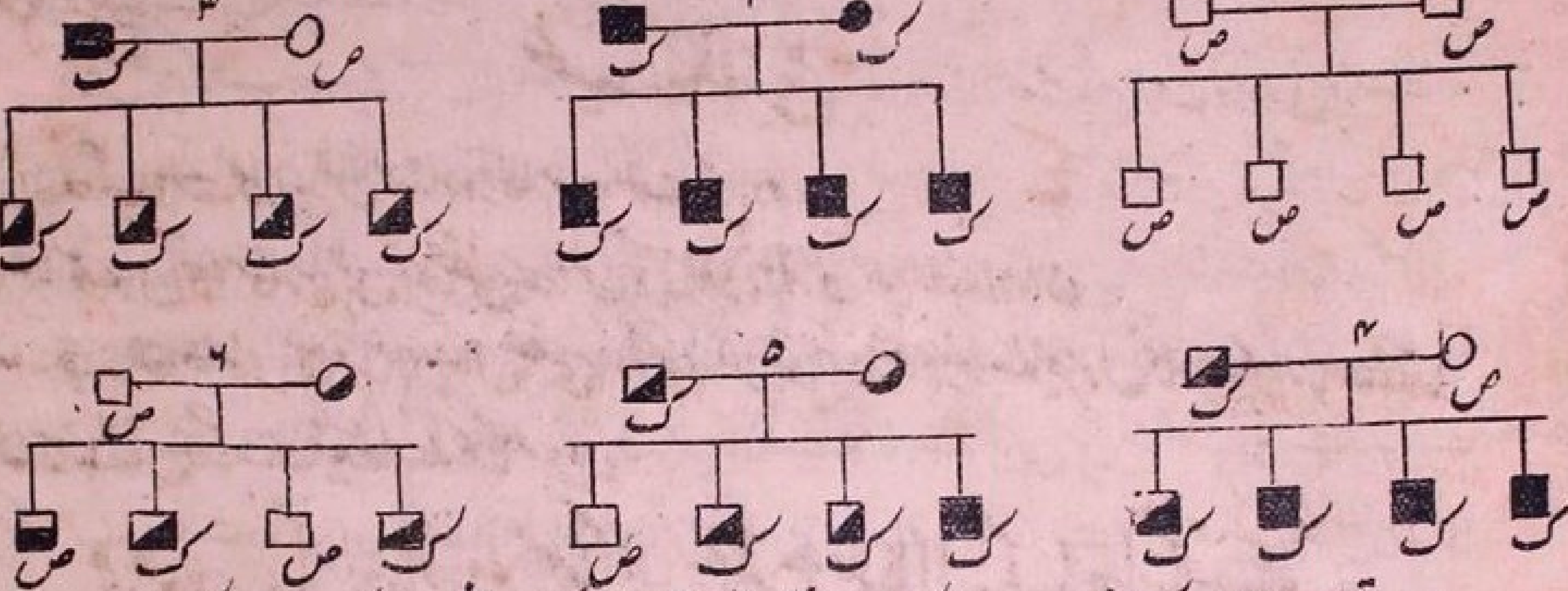

۲۔ تعلیم و تہذیب کی اشاعت: ایک مشہور فلسفی کا قول ہے کہ "جو شخص ایک مدرسہ کھولتا ہے وہ حقیقتاً ایک قید خانہ بند کرتا ہے۔" تعلیم حاصل کرنے سے انسانی مدارک و معلومات میں وسعت ہوتی ہے، روایات مذہبی و تاریخی، سیرت اکابر، علم الاخلاق وغیرہ کے مطالعہ سے، جو عقلی نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ انسان کو ہر قسم کے بُرے خیالات سے روکتے ہیں اور اُسے ارتکاب جرائم سے باز رکھتے ہیں۔

نظری تعلیم کی بہ نسبت عملی اور صنعتی تعلیم زیادہ مفید ہے۔ اگر والدین کی عقلی اور اخلاقی حالت کمزور ہو تو اولاد کو اُن کے قبضہ سے لے لینا چاہیے اور اُنہیں مفید پیشے سکھانا چاہئیں، جن میں بہترین پیشہ زراعت ہے۔

۳۔ امراض عصبی سے حفاظت: ایک مشہور ڈاکٹر نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اُن نوجوانوں کیلئے جو وراثت کے اثر سے ہیجان عصبی، کاہلی یا صرع وغیرہ عصبی امراض میں مبتلا ہیں، اُن کیلئے خاص شفاخانے کھولے جائیں، جہاں اُن کا دماغی علاج کیا جائے اور انکی عقلیں نقطہ اعتدال پر لائی جائیں۔

---

(۱) اشکال مذکورہ میں دائرے عورت کی علامت ہیں اور مربعے مرد کی۔

حرف "ص" صحت جسمانی اور سلامت عقل کی علامت ہے اور کاف عقلی و جسمانی کمزوری کی۔ جو دائرہ یا مربع نصف سیاہ اور نصف سفید ہے وہ بتاتا ہے اس شخص میں بعض صفات اچھی ہیں اور بعض بُری۔ مثلاً شکل اول میں والدین کی جسمانی اور عقلی حالت اچھی ہے تو اولاد بھی ان ہی کی مانند ہے۔ شکل دوم میں والدین دونوں حیثیتوں سے گرے ہوئے ہیں تو انکی نسل بھی گری ہوئی ہے۔ شکل سوم میں باپ بُرا اور ماں اچھی ہے تو اولاد میں کچھ خوبیاں اور کچھ برائیاں ہیں۔

۴- جن افراد کی عقلی حالت تعلیم و تربیت سے درست نہ ہو سکے اور کسی قسم کا علاج اُن کے حق میں مفید نہ ہو تو اُن کی فوجیں مرتب کرکے دور و دراز کی نو آبادیوں میں بھیجدیا جائے، تاکہ عام ہیئت اجتماعی خراب اثرات سے متاثر نہ ہو۔

علاج

۱- حاکم عدالت کا ماہر فن ہونا اور نظام عدالت کی اصلاح

۲- مجرموں کا امتحان طبی اور عقلی اور اس کی جسمانی اور عقلی حالت کا اندازہ

۳- جدید شفا خانوں کا قیام، جہاں عصبی اور عقلی امراض میں مبتلا ہونیوالے مجرموں کا علاج کیا جائے اور یہی شفا خانے اُن کے لئے قید خانے کا کام دیں۔

مجرموں کی حالت کا کس طرح مطالعہ کیا جاتا ہے

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اکثر مجرم عقلی حیثیت سے چند سال کے لڑکے سے بھی زیادہ کمزور ہوتے ہیں ایسے لوگوں کے حق میں سزا کچھ مفید نہیں ہے، بلکہ اُن کے اخلاق بجائے اصلاح پذیر ہونیکے اور بھی فاسد ہو جاتے ہیں لہذا ان کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ ایک عقلی مدرسہ میں رکھے جائیں، یہانتک کہ اُن کے اخلاق میں درستی اور عقول میں استقامت پیدا ہو اور اگر یہ نہ ہو سکے تو انہیں آبادی سے کسی دور مقام پر بھیجدیا جائے تاکہ عام سوسائٹی اُن کے شر سے محفوظ رہے۔

دنیا کی متمدن سلطنتوں نے اس کی طرف توجہ کی ہے اور مجرموں کی حالت کا نہایت غور سے امتحان شروع کیا ہے، چنانچہ اسی غرض سے نیویارک میں امراض نفسانی کا ایک محکمہ کھولا گیا ہے جس کا تعلق محکمہ پولیس سے ہے۔ اس محکمہ کا ایک کارکن کہتا ہے:-

"ہم نے سرکاری طریقہ پر کام کرنے سے پہلے، پچاس روز تک ذاتی تجربے کئے۔ ہم روز چند مشتبہ اشخاص کا انتخاب کرتے تھے، جن کی ظاہری حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی عقلی مرض میں مبتلا ہیں، پھر ہم اُن کا امتحان کرتے تھے۔ اس مدت میں ہم نے ۴۰۹ آدمیوں کا امتحان کیا، جن میں سے ایک دیوانہ دو جسم کے لحاظ سے ناقص، تین دائم الخمر، اور چودہ قاصر العقل تھے۔ ۴۰۹ میں صرف آٹھ شخص ایسے تھے جن کی جسمانی اور عقلی حالت درست تھی۔ ہمارے تجربہ سے اتنا...

یہ ثابت ہوا ہے کہ گرفتار شدہ مجرموں میں کم از کم پانچ فی صدی کے شعور میں خلل اور عقل میں نقصان ہوتا ہے۔"

امتحان عقلی کے بہت سے طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ مجرم سے چند سوالات کئے جاتے ہیں، جن سے اس کی قوتِ تمیز اور صحتِ عقل کا اندازہ لگایا جاتا ہے، ان سوالوں میں بعض مشکل اور بعض آسان ہوتے ہیں اور ہر ایک سوال کا جواب نموے عقل کے ایک خاص مرتبے پر دلالت کرتا ہے۔

امتحان کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ کر مجرم سے کسی چیز کی تصویر بنوائی جائے۔ اور لکڑی کے چند مساوی الحجم اور مختلف الوزن ٹکڑے اس کے سامنے رکھ کر اس سے کہا جائے کہ انہیں اُن کے وزن کی نسبت سے مرتب کر کے رکھے۔

نیاز

نقوشِ مانی

جب مکمل مری تسلیم کا قصہ نہ ہوا
تو بیاں آپ کی بیداد کا افسانہ ہوا

سُرمہ ہو کر ہی سہی، طور کی ہستی تو رہی
دل تو اتنا بھی حریفِ رُخِ زیبا نہ ہوا

حامیِ ہمتِ مردانہ ہے تقدیر، کہ دیکھ!
آدمی بن کے رہا وہ، کہ فرشتا نہ ہوا

ہاں سُنا، خوب سُنا تذکرۂ طور و کلیم
کیا کہوں ہائے مرا عہدِ تمنا نہ ہوا

اس حقیقت پہ یہ طوفان بڑی خیر ہوئی
کہ دل اک خون کے قطرے سے زیادہ نہ ہوا

زندگی میں مری فریاد، اب اُن کے آنسو
عشق کس حال میں، کس عہد میں، رسوا نہ ہوا

ساغرِ دیدۂ جاناں چھلک آئے مانی
آج لبریز مری زیست کا پیمانہ ہوا

مانی جائسی

معلومات

موجودہ فنِ پرواز

مغرب کی جنگ عظیم کا اگر کوئی احسان علمی دنیا پر ہوا ہے تو یہ کہ "انسانی پرواز" کا مسئلہ بڑی حد تک آسان ہو گیا، جس سے اب تمدنی اور اقتصادی دنیا بھی فائدہ حاصل کرنے کی آرزومند ہے۔

مدتوں سے اہل علم اور ارباب صنائع اس کوشش میں سرگرم تھے کہ کسی طرح "فن پرواز" کو تکمیل کی حد تک پہنچایا جائے بعض لوگ اپنی دولت و ثروت کی مدد سے بعض علمی و عملی قوت کے ذریعہ سے اور بعض گرانقدر انعامات اور قابلِ رشک عزت حاصل کرنے کی غرض سے اس مقصد کے حصول میں ساعی نظر آتے تھے۔ اٹلی نے جنگ طرابلس کے ختم ہونے سے پہلے ہی اپنے ہوائی بیڑے میں اضافہ شروع کر دیا تھا کیونکہ اُسے طیارات حربیہ کے فوائد بخوبی معلوم ہو چکے تھے۔

مغربی دنیا عرصہ سے اس مسئلہ پر نہایت غائر نظر ڈال رہی تھی اور جرائد و رسائل میں فنِ پرواز کے متعلق کثرت سے بحثیں ہو رہی تھیں۔ چنانچہ وہ وقت آیا کہ ارباب علم اور ماہرین فن کے مساعی سے یہ صنعت تکمیل کی حد تک پہنچ گئی اور ہوائی جہاز نہایت مکمل صورت میں فضائے آسمانی پر چکر لگاتا ہوا نظر آنے لگا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں جنگ عظیم شروع ہو گئی اور حکومتوں کو ضرورت ہوئی کہ ہوائی جہازوں کی کارخانے قایم کریں اور قدیم کارخانوں کو مدد دیں۔ چنانچہ ان مساعی کا یہ نتیجہ ہوا کہ دو سال گذرنے سے پہلے ہی طیاروں کی صنعت میں اس قدر اصلاحات اور مفید اضافے ہوئے کہ کسی کے خیال میں بھی نہ آ سکتے تھے۔

امریکہ کا کارخانہ کورٹس جو دو ہفتہ میں ایک ہوائی جہاز بنا سکتا تھا اب ہر چوبیس گھنٹے میں ایک جہاز تیار کرنے لگا۔ اور کام کرنے والوں کی تعداد ۱۵۰ سے ۲۵۰۰ تک بڑھا دی گئی۔ چونکہ زمانۂ جنگ میں پانچ ہزار ہوائی جہاز کام کرتے تھے اور ہر جہاز کی اوسط عمر دو ہفتہ سے زائد نہ تھی، اس لئے یہ کمی پوری کرنیکے لئے ہر سال پچاس ہزار جہاز تیار ہونے لگے۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ جنگ یورپ کی بدولت اس صنعت نے کس درجہ ترقی حاصل کی۔

دوران جنگ میں ہوائی جہازوں کی ساخت میں جو اصلاحات ہوئی ہیں انہیں ہم اختصار کے ساتھ اس مضمون میں بیان کرتے ہیں۔

کشتی نما حصہ

جنگ سے پہلے جہاز چلانے والا ایک معلق کرسی پر بیٹھتا ہے۔ اور جہاز کے تمام آلات اور پرزے بھی کھلی ہوئی ہوا میں رہتے تھے کیونکہ اصحاب فن کا پہلے یہ خیال تھا کہ پردہ کا وزن جس سے پرزے چھپائے جائیں گے جہاز کو نقصان پہونچائیگا۔ اور سطح کے بڑھ جانے سے اس کی رفتار بھی کم ہو جائیگی۔ لیکن بعد کے تجربوں سے ثابت ہوا کہ چھوٹے بڑے متعدد اجسام (مثلاً جہاز راں کے پاؤں، تانبے اور لوہے کے تار آلات برقی، موٹر کے پرزے) کی بہ نسبت ایک بڑے حجم اور بڑی سطح والے جسم کا ہوا سے مقابلہ کرنا زیادہ آسان ہے کیونکہ جہاز کے چلتے وقت ہر ایک پرزہ ہوا کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور اپنے پیچھے ہوا میں دور تک ایک راستہ بنا دیتا ہے جس طرح کہ کشتی اپنی رفتار میں پانی کو چیرتی اور اپنے پیچھے ایک راستہ چھوڑتی جاتی ہے، اس لئے اگر ان راستوں کو ایک کر دیا جائے تو زیادہ آسانی ہوگی۔ چنانچہ ایک کشتی نما حصہ بنایا گیا جس کے اندر تمام آلات اور پرزے رکھے گئے۔

سرعت رفتار

اس اصلاح سے زیادہ ضروری سرعت رفتار کا مسئلہ تھا، چنانچہ انجن کی قوت بہ نسبت پہلے کے تین بلکہ چار حصے زیادہ کر دی گئی۔ جنگی ہوا باز کے لئے اس قدر قوت کا انجن ہونا ضروری تھا تاکہ وہ آندھیوں اور بگولوں کا مقابلہ آسانی سے کر سکے (ایک سخت آندھی کا مقابلہ کرنیکے لئے ۵۰ گھوڑوں کی قوت درکار ہے) جنگ سے پہلے ہوائی جہاز راں تاوقتیکہ فضا کی حالت کا اندازہ نہ کرے پرواز کی جرأت نہیں کر سکتا تھا لیکن اب اڑتے وقت نہ ابر و باد کا خیال کیا جاتا ہے نہ آندھی اور بگولوں کا۔

سراغ رساں طیارے کا حجم

حربی ضروریات کی بناء پر ضروری تھا کہ طیارے کا حجم بڑھایا جائے تاکہ اس میں تین چار آدمیوں کے علاوہ توپیں اور گولے بھی رکھے جا سکیں۔ چنانچہ اس ضرورت کے لئے دو اور تین سطح والے بڑے جہاز تیار کئے گئے تھے جن میں صرف یہی عیب تھا کہ وہ تیز نہیں چل سکتے تھے اور یہ ذرا دشوار بھی تھا کیونکہ ایسا طیارہ جس کے دونوں بازوؤں کے درمیان ۱۰۰ فٹ سے زیادہ فاصلہ ہو کس طرح تیزی سے حرکت کر سکتا ہے، اس قسم کے بڑے

جہاز اکثر لڑائی سے پہلے بنائے جاتے تھے۔ روس کا جہاز سیکورسکی جو ۱۹۱۲ء میں تیار ہوا تھا، ۴ہم گھوڑوں کی طاقت رکھتا تھا۔ سترہ آدمی اس میں سوار ہو سکتے تھے اور ان کے کھانے اور سونے کا تمام انتظام اسی میں ہوتا تھا۔ ۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کرتا تھا لیکن پھر بھی جرمنی کاریگروں نے اس کی رفتار کو سست بنا یا اور ایک ہوائی ڈریڈناٹ سے اس کا مقابلہ کیا جو اس سے زیادہ سریع طاقتور اور وسیع تھا اور منجملہ اور سامان کے دو بڑی توپیں بھی اس میں آسکتی تھیں۔

کارخانہ کورٹس کا نیا طیارہ

کورٹس امریکہ میں ہوائی جہازوں کا مشہور کارخانہ ہے، اس کارخانے نے امریکہ نامی ایک بہت بڑا ہوائی جہاز تیار کیا تھا جس کی دنیا میں بڑی شہرت ہوئی اور آخر میں اس نے تین طبقے والے نہایت ہی عجیب طیارے بنائے "امریکہ" اس غرض سے بنایا گیا تھا کہ اس پر سوار ہو کر بحر اٹلانٹک کو عبور کیا جائے۔ اس کارخانہ کے بہترین جہاز وہ ہیں جن میں ۹۶۰ گھوڑوں کی طاقت ہوتی ہے۔ اور اس کے دونوں بازوؤں کے درمیان ۱۳۳ فٹ کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اس میں دس بارہ آدمی نہایت آرام کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں اور سونے کیلئے پلنگ اور کھانے کے لئے میزیں بھی اس میں موجود ہیں، پھر خوبی یہ ہے کہ فضائے آسمانی میں یہ جہاز متواتر کئی روز تک سفر کر سکتا ہے۔

اس قسم کا جہاز اگرچہ ۹۶۰ گھوڑوں کی طاقت سے چلتا ہے لیکن پھر بھی ۷۰۔۸۰ میل فی گھنٹہ سے زیادہ حرکت نہیں کر سکتا بخلاف اس کے "فکر" کی طرز کا جرمنی طیارہ جو صرف ایک سو گھوڑوں کی طاقت رکھتا ہے، ایک منٹ میں دو میل کے قریب مسافت طے کرتا ہے۔

ہوائی جنگ کی تدابیر

جہاز راں کو اکثر چھ صورتیں پیش آتی ہیں۔

۱۔ ایک طیارہ مغرب کی طرف جا رہا ہے اور دوسرا مشرق کی طرف۔

۲۔ دونوں طیارے ایک ہی سمت میں اڑ رہے ہیں۔

۳۔ ایک طیارہ دشمن طیارہ کی نسبت سے چھوٹا، ہلکا اور سریع ہو۔

۴۔ طیارہ اپنے دشمن پر قابو پانیکے لئے اس سے بلند ہو جائے۔

۵- طیارہ اپنے دشمن کو چھوڑ کر نیچے اُتر آئے اس طرح کہ اوپر والے طیارے کی سطح اُس کے جہاز راں کی نظر کے سامنے حائل ہو جائے۔

۶- تین یا چار طیارے اپنے دشمن کو گھیر لیں۔

پہلی صورت میں ہر جہاز راں اس امر کی کوشش کریگا کہ وہ مقابل جہاز کے بائیں طرف سے گذر جائے اور یہ اس لئے کہ بندوق چلانے میں آسانی ہو، کیونکہ عام عادت یہی ہے کہ بندوق داہنے کاندھے پر رکھ کر سرکی جاتی ہے اسی وجہ سے جس ہوا باز کو بائیں کاندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی عادت ہوتی ہے اس کی خاص طور پر قدر کی جاتی ہے کیونکہ وہ ایسی طرف سے فیر کر سکتا ہے جدھر سے دشمن کو گولی آنیکا خیال نہیں ہوتا۔

دوسری صورت میں داہنے اور بائیں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ جب دونوں جہاز ایک ہی سمت میں جارہے ہیں تو داہنی جانب والا بائیں پر آسانی سے فیر کر سکتا ہے۔

جب شکست خوردہ جہاز راں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا طیارہ بہ نسبت دشمن کے آہستہ چلتا ہے تو وہ دفعتہً اپنے دشمن سے نیچے ہو جاتا ہے اور نیچے ہی سے اس پر بندوق یا توپ چلاتا ہے۔ اس اُترنے کا ایک یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ اوپر والے طیارے کے بازو اُترنے والے جہاز کے درمیان حائل ہو کر اوپر والے کو فیر کرنے سے روکتے ہیں۔

ہوائی جنگ میں فضا کی حالت کو بھی بڑا دخل ہے، بسا اوقات ہزیمت خوردہ طیارہ ابر کے ٹکڑے میں جاکر پناہ لیتا ہے اور ابر اس کے لئے ایک مضبوط قلعہ کا کام دیتا ہے، کبھی شکست کھانے والا سیدھا آفتاب کے رخ پرواز کرتا ہے تاکہ آفتاب کی شعاعیں دشمن کی آنکھوں کو خیرہ کردیں۔ اور وہ اُسے نہ دیکھ سکے۔

دشمن سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بھاگنے والا طیارہ اپنی رفتار کو دفعتہً کم کردے اور تعاقب کرنے والا اپنی تیزی میں اُسے پیچھے چھوڑتا ہوا نکل جائے لیکن رفتار کے کم کرتے وقت اپنے خط پرواز سے نیچے ہونے کی بھی ضرورت ہے ورنہ تصادم کا سخت اندیشہ ہے۔

ہوائی جہاز میں بیٹھ کر گولی کا نشانہ پر لگانا اور شست کا صحیح ہونا نہایت مشکل ہے کیونکہ نشانہ اور نشانی باز دونوں ایک ایک سیکنڈ میں سیکڑوں فٹ آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ یورپ کے ماہرین فن اس دشواری کو بھی رفع کرنے کی کوشش میں ہیں۔ فی الحال اس کی یہ ترکیب رکھی گئی ہے کہ بندوق چلانیوالے

کے سامنے متعدد خانے رکھے گئے ہیں اور قواعد حسابی کی رو سے جس خانہ میں مناسب ہوتا ہے وہ بندوق رکھ کر سر کرتا ہے۔ بندوق چلاتے وقت درمیانی مسافت سرعت رفتار اور جہاز کے رخ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔

برف کی کان

امریکہ کے صوبہ پنسلفانیا میں ایک عجیب وغریب برف کی کان پائی جاتی ہے، جسے ایک کاشتکار نے دریافت کیا ہے۔

جب تک یہ کان دریافت نہیں ہوئی تھی یہ کاشتکار اپنے کھیت میں ہمیشہ غیر معمولی سردی پاتا تھا، حتی کہ موسم گرما میں بھی وہاں کی برودت ناقابل برداشت ہوتی تھی اس نے خیال کیا کہ شاید اس کھیت میں چاندی کی کان ہے۔ چنانچہ اس نے زمین کو کھودنا شروع کیا اور جب وہ کافی گہرائی تک پہنچ گیا تو اُسے معلوم ہوا کہ یہاں بجائے چاندی کے برف کا ایک طبقہ ہے جس کی گہرائی ۸۰ فٹ ہے اور چوڑائی ۱۳ فٹ ہے۔

اس برف کی کان پر سب سے زیادہ تعجب اس لئے کیا جاتا ہے کہ یہ گرمی میں جم جاتی ہے اور جاڑے میں پگھلنے لگتی ہے، علمائے طبقات الارض کو ابھی تک اس کا سبب نہیں معلوم ہوا کہ اس کا جمنا اور پگھلنا طبعی حالت کے خلاف کیوں ہے۔

کان کے اندر برف اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ گرمی کے زمانہ میں ایک مادہ کُہر کی طرح نکلتا ہے اور تھوڑی دیر میں برف کی مانند منجمد ہو جاتا ہے۔ پھر جس قدر گرمی زیادہ ہوتی جاتی ہے برف کا انجماد بھی بڑھتا جاتا ہے۔ ابتدا میں لوگوں نے کان کے اوپر سایہ کر دیا تھا لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ آفتاب کی شعاعیں روک دینے سے برف کا پیدا ہونا بند ہو جاتا ہے۔

کاشتکار مذکور کی بیوی نے اس قدرتی برف خانے میں ایک مخزن بنایا ہے، جس میں دفن کردینے سے ایک چیز مدت تک محفوظ رہتی ہے، ایک بار اس عورت نے اس مخزن میں انڈے رکھ دیئے، سات مہینے کے بعد ان کو نکالا تو وہ بالکل طبعی حالت پر تھے۔

چوروں کا برقی دشمن

مخترعین مغرب نے ایک عجیب وغریب برقی آلہ ایجاد کیا ہے جو چور کے آنے کی اطلاع فوراً ایک گھنٹی کے ذریعہ سے مالک مکان کو دیدیتا ہے۔ اس آلہ کے ذریعہ سے صاحب خانہ اس امر پر بھی قادر ہوتا ہے کہ وہ چور کے داخل ہوتے ہی اس پر ریوالور کا فیر کردے لیکن شرط یہ ہے کہ چور کے پاس لالٹین یا کم ازکم موم بتی ضرور ہو۔ یہ آلہ سیلینیم کی مدد سے تیار کیا گیا ہے جو روشنی سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اور روشنی کی شعاعوں کو کہربائی شعاعوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جب آلہ مذکور میں برقی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں تو وہ گھنٹی بجا دیتا ہے یا ریوالور کی لبلبی دبا کر فیر کر دیتا ہے۔

چونکہ چور عموماً بغیر روشنی کے اپنا کام نہیں کر سکتے اس لئے یہ آلہ فوراً گھنٹی یا ریوالور کے ذریعہ سے صاحب خانہ کو اطلاع کر دیتا ہے اور چور گرفتار یا ہلاک ہو جاتا ہے۔

نیاز

انتقاد

سفید جوگن۔ مصنفہ جناب بابو نرائن پرشاد صاحب ورما۔ مہر۔ ہمارے خیال میں یہ پہلا ناول ہے کہ اپنی محاسن معنوی کی ضمانت میں مولانا شبلی اور خواجہ حالی جیسے بزرگوں کی قیمتی رائیں پیش کرتا ہے جو اُسکے سرورق پر درج ہیں۔

جناب مہر سے ہم ذاتی تعارف رکھتے ہیں اور آپ کے کلام کو دیکھنے اور سُننے کا اکثر موقع ملا ہے۔ سلاست اور صحت زبان کیلئے جو کاوش آپ فرماتے ہیں اس کی شاہد آپکی تحریر ہے، اور اسی کوشش و احتیاط کا نتیجہ ہے کہ آپ نہایت فصیح اُردو لکھتے ہیں۔

آپ کا یہ ناول آپکی دماغ سوزی کا کافی ثبوت ہے اور باوجودیکہ انگریزی ناول کا ترجمہ ہے لیکن لندن اور پیرس کے جو مناظر دکھائے ہیں انکی تفصیل اور واقعیت حقیقتاً حیرتناک ہے۔ ہندوستان کی مشہور عالم پرستش گاہوں بنارس، الہ آباد اور اُجین کے منظر بھی اس ناول میں نظر آتے ہیں، اور نہایت دلچسپ ہیں۔

مشرقی اور مغربی طرز معاشرت پر جس پسندیدہ انداز سے بحث کیگئی ہے اور ہندو عورتوں کے جذبات شوہر پرستی کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ بہت ہی نتیجہ خیز اور نصیحت آمیز ہے۔

آرٹ پیپر کے نہایت خوشنما سرورق اور عمدہ سفید کاغذ کے ۲۰۰ صفحات کی ایسی کتاب کی قیمت عہ کچھ زیادہ نہیں۔

ملنے کا پتہ:۔ بابو بدری پرشاد صاحب ورما ایڈورس۔ بازار دانا ولی لشکر۔ گوالیار

ریاست جموں و کشمیر منظور شدہ

دربار پٹیالہ منظور شدہ

صاحبان

سرکاری و ملٹری محکمہ جات و گورنمنٹ اسکولوں و کالجوں و کلبوں و ریاستوں و لمیٹڈ فرمو و دیگر بڑے بڑے مشہور سوداگروں کو اعلیٰ تریں سامان متعلقہ سپورٹس یعنی کرکٹ۔ ہاکی فٹ بال ٹینس۔ بیڈ منٹن۔ پولو وغیرہ بغیر وی۔ پی کئے کھُلے طور پر ارسال کیا جاتا ہے۔ اور قیمت بعد ازاں پسند آنے پر وصول کی جاتی ہے۔ نیز ہم یہ گارنٹی بھی کرتے ہیں۔ جو مال پسند نہ آوے۔ وہ فوراً بغیر استعمال کئے واپس کر دیجئے گا۔ اور دام واپس لے لیجئے گا اس صورت میں تمام اخراجات کرایہ آمد و رفت پیکنگ وغیرہ ہم اپنی گرہ سے دینگے اس سے بڑھ کر آپ کی تسلی صرف مال کے خریدنے سے ہو سکتی ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ مکمل با تصویر فہرستیں مفت ارسال کی جاتی ہیں۔

المشتہر

ای۔ کیپر۔ اینڈ کو۔ سپورٹس مینوفیکچررز۔ سیالکوٹ سٹی

تار کا پتہ :۔ سیالکوٹ سٹی

وی سن مون شو فیکٹری

ہر قسم کے بوٹ اور شوز زنانہ و مردانہ خالص اور بہترین چمڑے کے تیار کیئے جاتے ہیں۔ مضبوطی و خوبصورتی کسی طرح ولایتی مال سے کم نہیں۔ علاوہ ازیں ہر فیکٹری سے نسبتاً مال ارزاں ملیگا۔ آپ کو صرف آرڈر دینے پر ہماری اس تحریر کی صداقت معلوم ہوجائے گی۔ زیادہ لکھنا فضول ہے۔

(وہاب الدین ظفر الدین۔
(لیڈر مرچنٹ ڈھولی کھار آگرہ)

سدھا سندھو

بلا انوپان کی دوا

کف۔ کھانسی ہیضہ۔ دمہ۔ اسہال سنگرہنی۔ پیٹ درد جی متلانا۔ بالکوں کے ہرے پیلے دست اور درد معدہ کی ایک خوش ذائقہ اور خوشبودار دوا صرف پانی میں ملا کر دینے سے ایک خوراک اپنا اثر دکھاتی ہے قیمت فی شیشی ۸ محصولڈاک ۱/

دورج گیسری یعنی داد کی دوا

بلا کسی جلن اور تکلیف کے دو تین مرتبہ لگانے سے ہی داد کو آرام کرنے کی سب سے اچھی دوا ہے قیمت فی شیشی ۸ ایک سے ۴ شیشی تک محصولڈاک ۸/

بال سدھا

کمزور اور دبلے پتلے اور اکثر بیمار رہنے والے بچوں کو طاقتور اور موٹا تازہ بنانے والی حکمی دوا ہے قیمت فی شیشی ۱۲/

پورا حال جاننے کے لئے بڑی جنتری مفت منگالو سب جگہ ایجنٹوں کی ضرورت ہے

ملنے کا پتہ

سکھ سنچارک کمپنی متھرا

عدم تعاون

کے باوجود بھی گھڑیاں خریدنا منع نہیں ورنہ ہندوستان میں کارخانے نہ ہونے سے لاکھوں گھڑی ساز بیکار ہو جاوینگے ہم سے ارزاں و مضبوط گھڑیاں طلب کیجیے ریگولیٹر گارنٹی ۵ سال قیمت للعہ امریکن لیور جیبی نقشی ساختہ ویسٹرن کلاک کمپنی گارنٹی دس سال قیمت ساٹھ روپیہ خلافت واچ معہ درود شریف گارنٹی سات سال قیمت پانچ روپیہ رسٹ واچ جنوامعہ تسمہ پانچ روپیہ لیور گارنٹی سات سال قیمت سات روپیہ۔ لیور جوہیدار گارنٹی۔ ۵ سال قیمت دس روپیہ اندھیرے میں وقت دینے والی تیرہ روپیہ

نیو برادرز کمپنی صدر بازار دہلی

گورنمنٹ سے قطع تعلق

کاریز و لیوشن چونکہ پاس ہو گیا ہے اس لئے باعزت روزگار کی تلاش ہے تو فوراً ہومیوپیتھک ڈاکٹری کی تعلیم بذریعہ خط و کتابت حاصل کریں جسکو دنیا کے ماہرین نے بے ضرر اور زود اثر کہا ہے۔ کامیاب طلبار کو کلکتہ سے ڈپلومہ عطا ہوگا داخلہ فیس ۲ ماہوار فیس عہ ماہوار غریبوں کو تعلیم مفت۔ ہر کانگریس کا ممبر بن جانا چاہیے ہر قسم کے سوتی ریشمی اونی پارچہ بافی صابن سازی موٹر ڈرائیوری بھی سیکھ سکتے ہو داخلہ معاف اپنا پتہ صاف خوش خط ہو۔

المشتہر:۔ بزم تجارت دہلی

حافظ امام الدین پبلشر نگار نے باہتمام خواجہ صدیق حسین مطبع آگرہ اخبار میں چھپوا کر شائع کیا